# حاجی لق لق کے افسانے

مکتبۂ اردو لاہور

# حاجی لق لق

کے

# افسانے

لاہور
مکتبۂ اُردُو

بار اوّل ۱۹۳۹ء
بار دوم ۱۹۴۱ء
بار سوم ۱۹۴۳ء

چوہدری نذیر احمد پرنٹر پبلشر نے اتحاد پریس مِل روڈ لاہور میں چھپوا کر مکتبہ اُردو لاہور سے شائع کی

# فہرس


فرشتوں کا امتحان ۵
السحذر از گوسفنداں الحذر ۱۷
لاہور کس نے دریافت کیا ۲۳
پنجاب کونسل ہال ۲۹
بلدیہ لاہور ۳۲
شجرِ تسلیم ۳۵
اخباری عجائب ۳۹
اخباری پالیسی ۴۳
یحییٰ آفندی کے دانت ۴۹
خفقان ۵۷

| | |
|---|---|
| مہاتما گاندھی سے ماسٹر تارا تک | ۶۳ |
| شاعر | ۷۱ |
| ایڈیٹر | ۷۷ |
| حاجی لق لق اور اسمبلی | ۸۳ |
| حاجی لق لق کا باپ | ۸۹ |
| لیٹربکس کا اغوا | ۹۳ |
| شملہ کی سیر | ۹۹ |
| پھر شملہ کی سیر | ۱۰۷ |
| دیسی لاٹ صاحب | ۱۱۳ |
| بوتل | ۱۱۹ |
| متحرک مشاعرہ | ۱۲۷ |
| ماتا | ۱۳۳ |
| عینک کا انتقال | ۱۳۷ |

# فرشتوں کا امتحان

جبریل امین کو پچیس سالہ رپورٹ تیار کرنا تھی۔ اُس نے فرشتۂ نہضت، فرشتۂ ثروت اور فرشتۂ رحمت کو طلب کیا اور کہا "آج تمہاری کارگذاریوں کا امتحان ہے، چلو زمین پر چلیں اور دیکھیں کہ تم نے اپنے اپنے حلقہ میں کیا کیا کام کیا ہے"؟

چاروں فرشتے جینوا میں اُترے۔ جبریل نے حکم دیا: "اپنی اپنی قوم کو حاضر کرو!" یہ حکم سن کر حضرتِ جبریل کے لفٹنٹ مختلف سمتوں کو پرواز کر گئے

## فرشتۂ نہضت کی کارگزاری!

نہضت کا فرشتہ "عیسائیل" لنڈن پہنچا۔ اور اس نے براڈکاسٹ کمپنی کے بڑے ریڈیو اسٹیشن سے اعلان کیا کہ تمام مسیحی اقوام فوراً جینوا پہنچ جائیں۔ اس کے بعد وہ برطانی وزیر اعظم کو چند ہدایات دے کر واپس جینوا چلا گیا۔

عیسائیل کا حکم ایک ہی لمحے میں ساری دنیا کے عیسائیوں نے سن لیا اور بعض

مقامات پر وائرلیس کے خاص پیغام بھیجے گئے۔ ہر طرف جینیوا جانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ یورپ اور امریکہ کی حکومتوں نے تمام سرکاری طیارے اپنے اپنے اہلِ ملک کے سفر جینیوا کے لئے مخصوص کر دیئے۔ فضائے آسمانی میں طیارے ہی طیارے اُڑتے نظر آنے لگے اور اُن کی گونج سے کان پھٹنے لگے۔

پانچویں روز عیسائیل نے جبریل کو فوجی سلام کیا اور رپورٹ کی کہ جناب میری قوم حاضر ہے جبریل نے ٹیلی وژن کے ذریعے اپنے ہوٹل کے کمرے میں ہی بیٹھے بیٹھے انسانوں کے اس ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کا معائنہ کیا اور عیسائیل نے لاؤڈ سپیکر پر اپنے سردار کی طرف سے سب کی مزاج پُرسی کی اور اُن کا خیر مقدم کیا۔

اگلے روز صبح کے وقت جبرئیل اور عیسائیل نے فضا میں پرواز کر کے اس انبوہ کثیر کا جائزہ لیا۔ طیارے مہمانوں کے لئے ہالینڈ کا مکھن، انگلستان کی سبزیاں، فرانس کی شرابیں، ترکی کے انگور اور دوسری ضروریات خورد و نوش لانے میں مشغول تھے۔ ایک طیارہ میں سے جو سارے کیمپ پر منڈلاتا پھر رہا تھا۔ کوئی شخص آلۂ نشرِ صوت کے ذریعے تازہ بتازہ خبریں سُنا رہا تھا۔ جا بجا سفری سینماؤں کے خیمے نصب تھے۔ کئی مقامات پر پبلک ٹیلی وژن نظر آ رہے تھے۔ کہیں کہیں شفاخانے دکھائی دیتے تھے۔ ایک ہسپتال میں کسی عورت کا اپریشن ہو رہا تھا۔ جبرئیل کے استفسار پر عیسائیل نے بتایا کہ اس عورت کو مرد بنایا جا رہا ہے۔

دونوں فرشتے ایوانِ مجلسِ اقوام کی چھت پر اُترے۔ جبرئیل نے اپنی نوٹ بک نکالی۔ اس میں کچھ کوائف درج کئے اور پھر عیسائیل سے مخاطب ہو کر کہا۔

"تمہاری قوم کی ترقی حیرت انگیز ہے اور ساری دُنیا کے عیسائیوں کا صرف پانچ روز کی مدت میں ایک مقام پر جمع ہو جانا تعجب خیز! تمہاری کارگذاری میری بست و پنج سالہ

رپورٹ کا ایک دلچسپ باب ہوگی۔"

عیسائیل فخر سے مسکرایا اور بولا۔

"جناب ابھی تک تو میں اپنے ارادوں میں نصف حد تک بھی کامیاب نہیں ہُوا۔ جب آپ اگلی رپورٹ تیار کریں گے تو میری قوم کے حالات کو بالکل مختلف پائیں گے۔ یہ سامانِ خورونوش جمع کرنے کا جھگڑا مٹ جائیگا۔ لوگ صرف ایک ایک گولی نگل کر کھانے پینے کی زحمت سے بے نیاز ہوسکیں گے اور یہ شفاخانے بھی آہستہ آہستہ مفقود ہو جائیں گے۔ کیونکہ میں کوشش کر رہا ہوں کہ امراضِ انسانی کے وجود کو دُنیا سے کالعدم کر دیا جائے۔ بلکہ موت پر فتح پاکر بیچارے عزرائیل کو پنشن دلوادی جائے اور یہ پانچ روز میں سب کا جمع ہو جانا تو بالکل معمولی بات ہے۔ میں اپنی قوم کو انسانی ترقیوں کی حسین منزل کی طرف لے جا رہا ہوں۔ وہاں طیاروں وغیرہ کی بھی ضرورت نہ ہوگی۔ انسان وائرلیس کے ذریعے چند لمحوں میں دُنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ جایا کرے گا اور پھر اس سے بھی ترقی کی جائیگی یعنی کسی مقام کا تصور ہی ایک لمحے کے دسویں حصے میں وہاں پہنچا دیا کرے گا۔"

جبرئیل نے مسکرا کر اپنے لفٹنٹ کی پیٹھ پر تھپکی دی اور کہا:۔

"شاباش تم بڑا کام کر رہے ہو۔ اب اپنی قوم کو رخصت کر دو!"

عیسائیل اس حکم کی تعمیل کرنے کے لئے پرواز کر گیا۔

## فرشتہ ثروت کی کارگزاری

اب ثروت کے فرشتہ "موسائیل" کی کیفیت سُنئے۔ اسکی قوم یہودی تھی ساتھ نے اُس نے جیتوا سے اڑ کر فلسطین کا رُخ کیا اور برطانی ہائی کمشنر سے مل کر دُنیا کے یہودیوں کے

نام اپنا پیغام بھیجنا چاہا، ہائی کمشنر نے اسے شُبہ کی نظروں سے دیکھا۔ مسلمانانِ مصر کا گماشتہ، آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایجنٹ، مولانا ظفر علی خاں کا بُروز، پنڈت جواہر لال نہرو کا ہمزاد یا مولانا محمد علی مرحوم کی رُوح تصور کیا۔ لیکن جب موسا ئیل نے قسمیں کھائیں اور یقین دلایا کہ اسے کسی پولیٹیکل تحریک سے واسطہ نہیں تو اُس نے صرف اتنا مان لیا کہ فلسطین کے سوا دوسرے تمام ممالک کو تار برقی یا بے تار برقی کے پیغام بھیجے جا سکتے ہیں بشرطیکہ اُن کی اُجرت سرکار انگریزی کے خزانے میں داخل کرائی جائے۔ موسا ئیل نے اس کا وعدہ کیا اور جمعیتِ صیہونیہ کے صدر کو بلا کر اسے حکم دیا کہ صاحب بہادر کا بِل ادا کر دیا جائے۔ لیکن فلسطین کے یہودیوں کا مسئلہ بے ڈھب تھا۔ زیادہ یہودی اسی خطّہ میں آباد ہیں اور ہائی کمشنر نے کہہ دیا کہ انہیں پیغام نہیں بھیجا جائے گا۔

موسا ئیل نے پوچھا۔ "آخر اسمیں کیا قباحت ہے؟"

جواب ملا۔ "قباحت؟ تم فرشتے ہو یا جانور؟ اتنی بھی خبر نہیں رکھتے کہ ہم نے آدھی دُنیا کی دُشمنی مُول لیکر ان یہودیوں کو فلسطین میں آباد کیا ہے؟ ہر طرف شور مچ رہا ہے کہ انہیں یہاں سے نکالو، بغاوت پھیل رہی ہے۔ کشت و خون کا بازار گرم ہے۔ لیکن ہم پروا نہیں کرتے اور پروا کریں بھی کس طرح؟ اگر آج ہم یہودیوں کو فلسطین سے نکال دیں تو قیامت کے روز چچا بالفور کو کیا مُنہ دکھائیں گے؟"

"جناب میں یہ تو نہیں کہتا کہ انہیں یہاں سے نکال دیجئے۔ یہ تو صرف چند روز کی چھٹی کا سوال ہے۔"

"آپ کے نزدیک یہ چھٹی کا سوال ہے۔ لیکن میرے نزدیک برطانی پالیسی کے ناموس کا مسئلہ ہے۔ جس کا تحفظ ہمارے لئے فرض ہے۔ خواہ سارا جہان ایک طرف ہو جائے ہم کبھی

گوارا نہیں کریں گے کہ یہودی فلسطین سے نکل جائیں۔"

"لیکن ہمیں انہیں واپس فلسطین پہنچا دینے کا کفیل ہوں۔"

"درست ہے۔ لیکن ان کا فلسطین سے باہر قدم رکھنا ہی برطانی وقار کی موت کے مترادف ہے خواہ یہ اخراج عارضی ہی کیوں نہ ہو جونہی فلسطین کی حدود سے باہر قدم رکھا۔ تمام مسلم ممالک کے اخبارات شور مچا دیں گے کہ حکومت برطانیہ مسلمانوں کے مطالبات کے سامنے جھک گئی اور یہودیوں کو فلسطین سے نکال دیا گیا۔ یہ ذلت گوارا نہیں کی جاسکتی"

"آپ اس مسئلہ پر دوبارہ غور کریں مجھے اپنی قوم کو ضرور حوالے جانا ہے۔"

"میں نے جو کچھ کہا، وہ آخری فیصلہ ہے اور اگر زیادہ حیل و حجت کرو گے تو معلوم رہے کہ انگریزی قانون میں سینکڑوں ایسی دفعات ہیں جن کے ماتحت فرشتوں کو بھی گرفتار کیا جاسکتا ہے۔"

موسائیل گرج کر بولا "خبردار! ایسی گستاخی کی اجازت نہیں دی جاسکتی"۔

ہائی کمشنر اپنی کرسی سے اچھل پڑا اور چیخ کر بولا "گستاخی اور اجازت؟ ٹھیرو! میں ابھی تمہیں اس زبان درازی کا مزہ چکھا دیتا ہوں"۔ یہ کہہ کر اس نے ٹیلیفون کی طرف ہاتھ بڑھایا لیکن فوراً رک گیا اور دھڑ کر کرسی پر گر پڑا۔ اس کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں - اور موسائیل اس کے چہرے پر نظر جماتے اس طرح دیکھ رہا تھا جس طرح مسمریزم کرنے والا اپنے معمول پر نظر جماتا ہے۔

ہائی کمشنر بیہوش پڑا تھا۔ لیکن اس کی آنکھیں ایک عجیب و غریب منظر دیکھ رہی تھیں فلسطین کا ملک ایک جنت نظر آرہا تھا۔ ہر طرف یہودی اور عیسائی آباد تھے، وہاں تھیں جن کے عالیشان مکان آسمان سے باتیں کر رہے تھے اور جن کی شوکت در رفعت شاہی محلوں کو خجل کرتی

تھی کوچہ و بازار میں سونے چاندی کی موٹر کاریں پھر رہی تھیں۔ ہرطرف زر و جواہر کے انبار لگے تھے اور ہر شخص کروڑپتی معلوم ہوتا تھا۔ یہودی تجارت صنعت اور زراعت کے کام کو سنبھالے ہوئے تھے اور عیسائی حکومت کو۔ سب سے عجیب بات یہ تھی کہ مسلمان عرب کا نشان تک نظر نہ آتا تھا۔

موسائیل نے اپنا ہاتھ اٹھایا اور ہائی کمشنر نے آنکھیں کھول دیں۔

"یہ بات؟"

"فرشتۂ ثروت اس سے بھی زیادہ کر سکتا ہے۔"

"شکریہ! آپ کا کام کر دیا جائیگا۔"

موسائیل ہائی کمشنر سے مصافحہ کر کے رخصت ہوا۔ ایک گھنٹہ کے بعد بیت المقدس کے یہودیوں کے نام موسائیل کا حکم ارجنٹ وائرلیس اور ٹیلیگرام کے ذریعے پہنچایا جا رہا تھا اور فلسطین کے یہودی جینوا جانے کی تیاریوں میں مشغول ہو گئے تھے۔

دقت یہ تھی کہ تمام ملک کے طیارے جینوا جا چکے تھے اور حکم یہ تھا کہ یہودی بسرعت ممکن وہاں پہنچ جائیں۔ بہرحال دولت بہت کچھ کر سکتی ہے۔ فوراً تمام ممالک کے بحری جہازوں کی خدمات حاصل کر لی گئیں۔ جہاں جہاں ریل تھی، وہاں سپیشل ٹرینیں چلائی گئیں اور تمام دُنیا کے یہودی دسویں دن جینوا میں جمع ہو گئے۔

جبرئیل نے ان کا معائنہ کر کے ضروری کوائف اپنی نوٹ بک میں لکھے اور جب وہ لکھ رہا تھا تو موسائیل نے عیسائیل کے کان میں کہا۔

"تمہاری قوم بھی بڑی دلچسپ ہے۔ فرشتوں سے بھی اپنا محصول وصول کر لیتی ہے ——— اور انہیں گرفتاری تک کی دھمکی دینے سے نہیں جھجکتی۔"

# فرشتۂ رحمت کی کارگذاری

فرشتۂ رحمت اسلامیل جینیوا سے اُڑکر ترکیب میں پہنچا اور غازی مصطفےٰ کمال اتاترک سے ملاقی ہوا۔ غازی نے حکم سُنکر ذرا تامل کیا۔

غازی۔ بسر وچشم حاضر ہو جاؤں گا۔ لیکن افسوس ہے کہ میری ساری قوم نہیں جا سکتی کیونکہ درۂ دانیال اور آبنائے باسفورس کے استحکامات فوجوں سے ایک لمحہ کے لئے بھی خالی نہیں چھوڑے جا سکتے۔"

اسلامیل۔ "آپ اسکی فکر نہ کریں میں تمام قلعوں پر فرشتوں کو مقرر کردوں گا۔"

غازی۔ بجا ہے لیکن میں تاسف کرتا ہوں کہ فرشتے میرے کسی مصرف کے نہیں میرے وطن کی حفاظت صرف تُرک ہی کر سکتے ہیں۔"

اسلامیل۔ "لیکن چند روز کی غیر حاضری سے یہاں کیا قیامت آجائیگی؟"

غازی۔ آپ ہمارے سرپرست فرشتہ ہیں اور صحیح ہے کہ آپ ہی کی عنایت ہم پر سایہ کئے ہوتے ہے اور آپ کے جائز حکم سے سرتابی نہیں کی جا سکتی لیکن اس کے باوجود میں عرض کردوں گا کہ آپ کو میرے سیاسی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق حاصل نہیں میں ترکوں کی ممکن تعداد لیکر جینیوا پہنچ جاؤں گا۔ آپ مطمئن رہیں۔

اسلامیل نے اتنا ہی غنیمت جان کر عراق کا رُخ کیا اور بغداد پہنچکر شاہ غازی سے ملاقات کی۔ نوجوان بادشاہ نے کہا "کہ میں اپنی قوم لیکر حاضر ہو جاؤں گا۔"

اسلامیل۔ "آپ کے پاس طیارے کافی تعداد میں موجود ہیں اور موٹر گاڑیاں تو ملک میں بے شمار ہیں۔ اسلئے آپ کسی دوسرے ملک کے مسلمانوں کی نقل وحرکت میں بھی امداد

کر سکتے ہیں؟

**شاہ غازی**: ہرگز نہیں، عراق عراقیوں کے لئے ہے اور اس کی ہر چیز باشندگانِ وطن کی خاطر۔ مجھے اِس بے قاعدگی سے معاف رکھئے!

بغداد سے فارغ ہو کر اسماعیل حجاز پہنچا اور سلطان ابن سعود سے یُوں گفتگو ہوئی:۔

**ابن سعود**: کیا اچھا ہوتا کہ یہ اجتماع جنیوا کی بجائے مکہ معظمہ میں کیا جاتا تاکہ تمام مسلمانانِ عالم کی آمد سے ہم خادمانِ حرمین الشریفین کو کوئی مالی فائدہ بھی پہنچتا؟

**اسماعیل**: میرے بس کی بات نہیں حضرت جبریل نے ایسا ہی حکم دیا ہے۔

**ابن سعود**: کیا آپ واپس جا کر حضرت جبریل کو یہ مشورہ نہیں دے سکتے کہ وہ اس معائنہ کو آئندہ حج کے موقع تک ملتوی رکھیں۔ میں ہندوستان اور دیگر اسلامی ممالک میں مختلف ذرائع سے پروپیگنڈہ کرا دوں گا کہ آئندہ حج کے لئے زیادہ سے زیادہ مسلمان آئیں کیونکہ حضرت جبریل امین اسلامی اجتماع کا معائنہ کریں گے؟

**اسماعیل**: یہ نہیں ہو سکتا۔ آپ جنیوا چلنے کی تیاری کیجئے اور جلد سے جلد وہاں پہنچنے کا انتظام کیجئے!

**ابن سعود**: مجھے اس سے انکار نہیں لیکن جلدی پہنچنا مشکل ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ پہلے تو تمام ملک میں حکم بھیجنے کیلئے کافی وقت درکار ہے اور پھر سفر زیادہ تر اونٹوں کے ذریعے کیا جائیگا۔ میرا ایک آدھ ذاتی طیارہ اور دس بیس موٹر کاریں کتنے مسلمانوں کو لے جاسکیں گی؟

**اسماعیل**: یہ درست ہے، بہرحال حتی الامکان سرعت سے کام لیجئے ——— فی امان اللہ!

**ابن سعود**: اللہ معک!

مکہ معظمہ سے رخصت ہو کر اسماعیل افغانستان پہنچا جہاں کے جواں سال بادشاہ

محمد طاہر شاہ نے حکم سنکر ادب کے ساتھ عرض کیا کہ تعمیل حکم سے انکار ممکن نہیں لیکن اس کا کیا علاج کہ افغانوں کا ایسی جگہ لے جانا خطرناک ہے جو غازی امان اللہ کے قریب ہو"
اسلامیل نے یہ سن کر حجاز کا اخبار "ام القریٰ" جیب سے نکالا اور بادشاہ کے سامنے رکھ دیا جس میں لاہور کے ایک ہندو اخبار کے حوالے سے لکھا تھا کہ غازی امان اللہ خاں حبشہ چلے گئے ہیں اور اغلب ہے کہ انہیں وہاں کا حکمران بنا دیا جائے گا"
شاہ افغانستان مطمئن ہو گیا اور اس نے کہا کہ بسر و چشم! میں اپنی قوم کو لے کر حاضر ہو جاؤں گا۔ اسلامیل وہاں سے روانہ ہو کر مختلف ممالک کا چکر کاٹتا ہوا ہندوستان پہنچا۔

دہلی سے اس نے اپنا حکم ایسوسی ایٹڈ پریس کے ذریعے تمام اخبارات میں لکھوا دیا اگلے روز مسلمانان ہند میں "ہجرت جینوا" کا جوش پھیل گیا لیکن سوال یہ پیدا ہو گیا کہ مسلمانان ہند کا امیر ملت کون ہو۔ جناب عزیز ہندی نے تجویز پیش کی کہ یہ قافلہ حضرت مولینا ابو الکلام آزاد کی قیادت میں روانہ ہو۔ ایک طرف سے آواز اٹھی کہ شیخ خالد لطیف گابا کو امیر ملت بنایا جائے۔ اور عدالت سے درخواست کی جائے۔ کہ وہ شیخ صاحب کی آئندہ پیشی اس وقت تک ملتوی رکھے جب تک کہ اسلامی قافلہ جینوا سے واپس آجائے۔ یہ بات مان لی گئی لیکن عدالت نے اس بات کو نہ مانا۔ اس لئے کسی دوسرے امیر ملت کی تلاش شروع ہو گئی ایک مسلم اخبار نے لکھا کہ بمبئی تک خواہ کوئی شخص امیر ملت بنے لیکن آگے چونکہ بحری سفر ہے۔ اس لئے سمندر میں اسلامی قافلہ کے قائد امیر البحر سند باد جہازی ہوں۔ حاجی لق لق نے اعلان کیا کہ اگر یہ فخر مجھے بخش کر جینوا کا حج کرا دیا جائے۔ تو مسلمانوں کو ثواب عظیم حاصل ہو گا۔ غرض یہ جھگڑا ایک مہینہ تک جاری رہا۔ اور آخر یہ فیصلہ ہوا۔ کہ کسی خاص

امیرملّت کی ضرورت نہیں۔ تمام جماعتیں اپنے اپنے طور پر روانہ ہوجائیں۔
لیکن جب تاریخ روانگی مقرر ہوگئی اور سب مسلمان چلنے کی تیاریاں کرنے لگے۔
تو ساہوکار بھی کھاتے لئے اور سود خوار پٹھان لٹھ سنبھالے آدھمکے اور شور مچانے لگے کہ لاؤ ہمارا قرضہ۔ مسلمان اس آفت سے بہت گھبراتے اور سوچنے لگے کہ اب کیا کیا جائے؟ بالآخر سولسٹوں نے ان کی دستگیری کی اور پہلے تو قرضخواہوں کو منت سماجت سے سمجھایا اور جب وہ نہ مانے۔ توانہوں نے کہا "کہ جب یورپ کی بڑی بڑی حکومتیں اپنے سیٹھ امریکہ کا قرضہ نہیں دیتیں تو یہ غریب مسلمان آپ کو قرضہ کیسے ادا کرسکتے ہیں؟ جاؤ بھاگ جاؤ، قرضہ نہیں دیا جاسکتا"
یہ کہکر انہوں نے مسلمانوں کی حوصلہ افزائی کی اور کہا کہ آپ چلے جائیے۔ ہم ان سے نپٹ لیں گے۔
ساہوکار اور سود خوار پٹھان یہ دھمکی سن کر سہم گئے اور گردنیں جھکائے جدھر سے آئے تھے۔ ادھر ہی کو چلے گئے۔ اب مسلمانوں کے قافلے دانہ ہونے شروع ہوئے۔ ایک قافلہ کے آگے سُرخ جھنڈا تھا جس پر چاند وتارے کا نشان بنا ہوا تھا۔ اس کے پیچھے لوگ "مولٰنا حبیب الرحمٰن زندہ باد" "مجلس احرار زندہ باد" "غلام نبی جانباز زندہ باد" کے نعرے لگاتے جاتے تھے۔ دوسرے قافلے کے آگے نیلگوں علَم تھا اور "مولٰنا مظفر علی خاں زندہ باد" "مجلس اتحاد ملت زندہ باد" "میر محمد الدین تبریز زندہ باد" کے نعرے بلند ہورہے تھے۔ ایک سیاہ پوش گروہ سیاہ علَم کے پیچھے سینہ کوبی کرتا ہوا جارہا تھا۔ ایک قافلہ کے تمام افراد کندھوں پر بیلچے اٹھائے ہوئے تھے۔ اس طرح یہ مختلف قافلے جلسے منعقد کرتے منزل بہ منزل المبئی پہنچے اور رات کو ہر قافلہ نے اپنا اپنا جلسہ اس غرض سے منعقد کیا کہ اہل بمبئی سے

چنیدے کی اپیل کی جائے اور جنیوا تک کا کرایہ حاصل کیا جاتے۔ ہر جلسہ میں دھواں دھار تقریریں ہو رہی تھیں اور زندہ باد کے نعروں سے فضا گونج گونج اٹھتی تھی کہ دفعتہً ایک ناگوار حادثہ پیش آیا۔ ایک جلسہ میں مدح صحابہؓ کے چند اشعار پڑھے گئے جسے سن کر سیاہ پوش جلسہ کے حاضرین اس ہمسایہ جلسہ پر ٹوٹ پڑے اور لڑائی شروع ہو گئی۔ ادھر دوسرے جلسہ میں کسی نے مجلس احرار مردہ باد" کا نعرہ لگایا اور سرخ پوشوں کی فوج نیلی پوشوں سے گتھم گتھا ہو گئی۔ ہنگامہ مچ گیا حتیٰ کہ پولیس اور فوج کو مداخلت کرنی پڑی اور گورنر بمبئی کے حکم سے پولیس نے لاٹھی چارج کر کے تمام قافلوں کو بمبئی کی حدود سے باہر نکال دیا اور شہر میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی گئی۔

لیکن بعض دانا رہنماؤں نے ایک مجلسِ مشاورت منعقد کر کے تمام قافلوں میں مصالحت کرا دی اور فیصلہ کیا گیا کہ یہ قافلے خشکی کے راستے پیدل جنیوا پہنچیں۔ چنانچہ فوج بے قائد بمبئی سے شمال کی طرف روانہ ہوئی اور جب جنیوا میں پہنچی تو جبرئیل علیہ السلام کو جنیوا میں بیٹھے تقریباً ایک سال کا عرصہ گذر چکا تھا۔

شہر جنیوا کے باہر مختلف اسلامی ممالک کے باشندے مدتوں سے بیٹھے اپنے ہندوستانی بھائیوں کا انتظار کر رہے تھے اور جب یہ لوگ وہاں پہنچے تو انہوں نے اپنے علیحدہ علیحدہ کیمپ لگائے۔ جبرئیل نے یہ حالت دیکھ کر اسلامیل سے کہا کہ "خدا کے لئے انہیں ایک جگہ جمع کر دو۔ تاکہ میں بآسانی معائنہ کر سکوں"۔

اسلامیل اٹھا اور ہر قافلے میں جا جا کر تلقین کرنے لگا کہ ایک ہی جگہ جمع ہو جاؤ لیکن جب وہ اتحاد کا نام لیتا تو نعرے بلند ہو جاتے۔ "اسلامیل مردہ باد"

جبرئیل نے نوٹ بک نکالی اور عرصہ تک اس میں اسلامیل کی قوم کے

متعلق کچھ لکھتا رہا لیکن آج تک ہم یہ جاننے کی آرزو رکھتے ہیں کہ جبرئیل نے اپنی
نوٹ بُک میں مسلمانانِ ہند کے متعلق کیا لکھا ۔

# الحذر از گوسفنداں الحذر

آپ نے اپنے شہر سے دوسرے شہر تک کئی دفعہ سفر کیا ہو گا اور کئی بار تجربہ ہوا ہو گا۔ کہ کسی دوست نے کہا "بھائی جان! منزلِ مقصود پر جا کر یہ چٹھی میرے فلاں دوست تک پہنچا دیجئے گا"۔ یا "اچھے آموں کی ایک ٹوکری آپ کے حوالے کر دی اور کہا کہ وہاں جا کر میرے چچا کے گھر پہنچا دیجئے گا" لیکن ایسا کبھی نہ ہوا ہو گا کہ کسی دوست نے کہا ہو۔ "حضرت یہ دو بکریاں لیتے جایئے اور فلاں شخص تک پہنچا دیجئے"۔

یہ معاملہ ہمارے ساتھ ہوا۔ ہم ملتان جا رہے تھے کہ ہمارے ایک دوست نے کہا "تکلیف تو ہو گی۔ اگر آپ میری دو بکریاں حرم دروازے میں شیخ اللہ بخش کے ہاں پہنچا دیں تو ممنونِ احسان ہوں گا"۔

ہم بکریوں کا نام سُن کر بوکھلا سے گئے۔ لیکن ہمیں اس دوست کا کہنا ضرور ماننا تھا اسلئے جواب دیا کہ بھائی مجھے اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ انہیں اسٹیشن

پہنچانے کا کیا بندوبست ہوگا؟ کوئی کوچوان تو انہیں ٹانگے میں بٹھا کر لے جانے سے رہا۔ باقی رہے بس والے، وہ بھی صرف دو ٹانگوں والے حیوانوں کو سوار ہونے کی اجازت دیتے ہیں۔ اسلئے اگر آپ بکریاں اسٹیشن تک پہنچا دیں تو عنایت ہوگی۔

ہمارے دوست ہمیں یہ رعایت دینے پر رضامند ہو گئے اور اگلے روز صبح ہم اور بکریاں اسٹیشن پر پہنچ گئے اور پہنچ گئیں۔

بکریوں کو بک کرایا گیا اور ریل والوں نے ہر ایک کے گلے میں تاگا باندھ کر ایک ٹکٹ لٹکا دیا۔ ہم بکریاں لئے پلیٹ فارم پر پہنچ گئے اور ایک جگہ کھڑے ہو کر ریل اور ریل کے اس ملازم کا انتظار کرنے لگے جس کا فرض بکریوں کو گارڈ کی بریک میں بٹھانا تھا۔

اب کرنا خدا کا یہ ہوا کہ سگریٹ سلگاتے وقت ہمارے ہاتھ سے بکریوں کی رسیاں چھوٹ گئیں اور ایک بکری ایک پان سگریٹ بیچنے والے کے خوانچے پر جھپٹ پڑی اور ہٹانے ہٹاتے چند پان اٹھا ہی تو لے گئی۔ دوکاندار نے چلانا شروع کیا اور بکری خاموشی کے ساتھ پان کھانے لگی وہ ایسی نگاہ سے پان فروش کی طرف دیکھ رہی تھی گویا کہہ رہی ہے "کیوں جی آپ برہم کیوں ہوتے ہیں؟ جب انسان منہ میں پان رکھکر بکری کی طرح جگالی کرتا ہے تو بکری انسان کی طرح پان کیوں نہ کھائے اور جب انسان ہماری نباتات مثلاً شلغم، مولی، ساگ پات پر ہاتھ صاف کرتا ہے تو ہم انسان کی من بھاتی نباتات یعنی پان پر کیوں دانت نہ تیز کریں؟"

پانفروش بڑبڑاتا ہوا زمین پر گرے ہوتے پان اٹھا اٹھا کر خوانچے میں رکھ رہا تھا اور ہم بکری کی طرف دیکھکر مسکرا رہے تھے۔ ہم حیران تھے کہ کتھے چونے کے بغیر پان کھانا کیا معنی؟ کمبخت بکری! اگر تم نے پان ہی کھانا تھا تو کتھا چونا لگے ہوئے پان اٹھاتی۔ ہم نے دو پیسے نکالکر پانفروش کی طرف پھینکے اور کہا کہ بکری کے منہ میں کتھا چونا اور چھالیہ ڈال دو!

اس پر پانفروش بہت بگڑا اور ہمارے قریب آکر بولا "بالوجی! آپ میرے پانوں کے پیسے دلا دیجیے!" اس کا ہماری طرف بڑھنا تھا کہ دوسری بکری اس کے خوانچے کی طرف جھپٹی پانفروش نے گھوم کر اس کی تھوتھنی پر ایک تھپڑ رسید کیا اور اُسے ہماری طرف دھکیل دیا لیکن اس عرصہ میں پہلی بکری پان ختم کر چکی تھی۔ اس لئے جب پانفروش دوسری بکری کو دھکیلنے میں مصروف تھا تو پہلی پھر خوانچے کی طرف بڑھی خوانچے والے نے شور مچاتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اس طرح انہیں دھکیلنا شروع کیا کہ وہ بھاگ اُٹھیں لیکن ایک ہی طرف کو نہیں بلکہ ایک پلیٹ فارم کی اس طرف کو جدھر سے "ڈاؤن ٹرین" آتی ہے اور دُوسری اس طرف کو جدھر سے "اپ ٹرین" آتی ہے۔ ہمارے ہاتھ سے سگریٹ گر گیا۔ ہم "اپ" بکری کی طرف بے تحاشا بھاگے اور بھاگتے وقت "ڈاؤن" بکری کی طرف اشارہ کر کے ایک قلی سے کہدیا کہ اسے پکڑ لاؤ۔ ایک آنہ دیں گے۔ اب آگے آگے بکری اور پیچھے پیچھے ہم۔ چلا چل۔ چلا چل۔ ہم وہیلر کے بُک سٹال سے آگے نکل گئے۔ بکری ہمارے ہاتھ آیا ہی چاہتی تھی کہ اس کی ٹکر ایک چائے فروش کی ٹانگوں سے ہو گئی جو سر پر خوانچہ اُٹھائے اسی طرف کو جا رہا تھا جس طرف کو ہم یعنی ہماری طرف اس کی پیٹھ تھی۔ چائے فروش اس "عقبی گھونسے" سے ایسا گھبرایا کہ خوانچہ اس کے سر پر سے نیچے آ رہا۔ چائے کا دیگچہ لڑھکتا ہوا پلیٹ فارم سے نیچے لائن پر جا ٹھیرا اور مٹی کی کوریاں چُور چُور ہو گئیں لیکن چائے فروش کو یہ معلوم کرنے سے پہلے کہ یہ کیا حادثہ گزرا ہے، یہ فکر ہوئی کہ اپنے پیسے چُنے جو فرش پر بکھر گئے تھے۔

ہم نے بکری کو تھاما اور چائے فروش نے ہمیں آ پکڑا کہ بالوجی ہمارے نقصان کا ہرجانہ دو۔ ارد گرد لوگ جمع ہو گئے اور سب متفق اللسان ہو کر کہنے لگے کہ "بالو صاحب! آپ کو پیسے دینے چاہئیں۔ چائے فروش بے چارہ غریب آدمی ہے۔" ہم چاہتے تھے کہ کسی طرح

معاملہ ٹل جائے۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا اور ہم نے اس سے کہا۔ آؤ ہمارے ساتھ!

اب "ڈاؤن" بکری کا حال سُنئے۔ ہم جب "اپ" بکری کو لئے جا رہے تھے تو سامنے سے قلی "ڈاؤن" بکری کو پکڑے آ رہا تھا۔ لیکن ساتھ ایک ٹکٹ کلکٹر بھی تھا۔ جب ہمارا اُن کا کراس "ہوا اور ہم ٹھہر گئے ——— تو "مخلوط النسل" ٹکٹ کلکٹر لگا ڈیم فول کہنے۔ ہم نے پُوچھا "صاحب کیا معاملہ ہے؟" صاحب بہادر بولے "ڈیم یو۔ یہ تُمہارا بکری ہمارا دفتر میں آ گیا اور میز پر چپ بیٹھ گیا۔ سب ڈوات لوگ الٹ گیا اور ہمارا رجسٹر کھراب ہو گیا۔ ہم ٹم کو سٹیشن ماسٹر صاحب کے پاس لے جانا مانگتا۔ مالوم؟"

ہم نے اپنے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ چار "فرضخواہ" ہمارے اردگرد کھڑے تھے۔ چائے فروش پان فروش، قلی اور ٹکٹ کلکٹر۔ ہم نے پہلے تین آدمیوں کو مُنہ مانگے دام دیکر رخصت کیا اور بکریوں کی رسیاں تھامتے ہوئے صاحب بہادر سے معذرت طلب کی پہلے تو وہ مانتے نہ تھے لیکن آخر کار ایک دو شرفا نے جو پاس آ کھڑے ہوتے تھے۔ سفارش کر کے ہماری جان چھڑائی۔

اتنے میں ٹرین آئی اور ریلوے کے ایک خاص پورٹر نے آکر بکریوں کو گاڑی میں سوار کیا۔ ہم کچھ عرصہ تک وہیں کھڑے رہے اور ہم نے دیکھا کہ "اپ" بکری نے "ڈاؤن" بکری کا ٹکٹ کھا لیا اور "ڈاؤن" بکری "اپ" بکری کا ٹکٹ چبا گئی ہم نے چاہا کہ بھاگ کر بکنگ والے دفتر میں اطلاع کریں لیکن گاڑی نے وسل کیا اور ہم بھاگ کر ایک ڈبے میں گُھس گئے، اور گاڑی چل پڑی۔

رائے ونڈ کے سٹیشن پر ہم کو گاڑی بدلنا تھی چنانچہ ہم اُترے اور بکریاں بھی اُتریں چند منٹ کے بعد ایک ٹکٹ کلکٹر صاحب ٹہلتے ٹہلتے قریب آئے اور بولے "بکریوں کے

ٹکٹ کہاں ہیں ؟ ہم نے کہا "ان کے پیٹ میں" بابو صاحب سمجھے کہ ہم ان سے تمسخر کر رہے ہیں اس لئے لال پیلے ہو کر بولے "ہم چارج کریں گے ادھر لاؤ انہیں دفتر کی طرف" ہم نے عرض کیا "حضور ہم نے آپ سے مذاق نہیں کیا۔ ٹکٹ بکریوں کے پیٹ میں ہیں۔ اگر یقین نہ ہو تو ان کا ایکس ریز کرا دیکھئے" اس پر بابو صاحب اور بھی برافروختہ ہوئے اور لگے گارڈ کو آوازیں دینے۔ گویا ایک مددگار بلا کہ ہمیں پھینٹا چاہتے تھے۔ گارڈ آیا اور اس نے شہادت دی کہ بکریاں "ٹکٹ شدہ" ہیں اور میری کتاب میں درج ہیں۔

ٹکٹ کلکٹر صاحب مطمئن ہو کر ایک طرف کو چل دیئے اور ہم سگریٹ سلگانے لگے کہ گاڑی نے بڑے زور سے وسل کیا جس سے ڈر کر بکریاں پھر بھاگ اٹھیں اور ہمارے سامنے پھر وہی اپ اور ڈاؤن کا معاملہ پیش ہوا لیکن اس دفعہ ہم نے خود تعاقب نہ کرنے کا فیصلہ کیا اور صرف قلیوں سے کہا کہ بھئی انہیں پکڑ لاؤ اور پیسے لے لو، ایک ایک آنہ دیں گے۔

بکریاں پھر ہمارے پاس لائی گئیں اور اب کے ہم ایسے پریشان تھے کہ اگر چھری پاس ہوتی تو دونوں کو آنیوالی "عید الضحیٰ" کے سلسلے میں بمد پیشگی ذبح کر کے خدا پہ احسان کرتے لیکن ہم بے بس تھے۔

آخر ہمیں ایک خیال سوجھا۔ ہمارے شہر کے باشندے بابو عطا محمد صاحب یہاں کے ٹکٹ کلکٹر تھے۔ ہم بکریاں لئے اُن کے پاس پہنچے اور کہا کہ قاضی صاحب یہ لیجئے دو بکریاں انہیں پاس رکھئے۔ لاہور سے کوئی آدمی ہماری چٹھی دکھا کر انہیں لے جائیگا۔" قاضی صاحب رضامند ہو گئے اور ہمیں ان بکریوں سے نجات ملی لیکن بہرحال ہمیں ڈاکٹر اقبال کے فلسفے کا پتہ چل گیا کہ انہوں نے کیوں کہا تھا:۔

الحذر از گوسفنداں الحذر

لوگ کہیں گے کہ گوسفند بھیڑ کو کہتے ہیں اور ڈاکٹر اقبالؔ کا مطلب بھیڑیوں سے تھا۔
لیکن ہمیں یقین ہے کہ علاّمہ کا مطلب بکریوں سے تھا اور خصوصاً مذکورہ بالا دو بکریوں سے
اس کے علاوہ ہم پر اس ضربُ المثل کا راز بھی کھُل گیا کہ "غم بخواہی بُز بخر" کیوں کہا گیا ہے۔

---

# لاہور کس نے دریافت کیا

ہمارے دیہات میں مشہور ہے کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا۔ وُہ پیدا ہی نہیں ہوا
اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دیہاتی لوگ پیدا ہونے کے لئے اکثر لاہور آتے رہتے ہیں اور بعض کو گھر
بیٹھے مختلف راستوں سے لاہور نظر آجاتا ہے۔ لیکن ہم چونکہ بہت عرصے سے پیدا ہو چکے ہیں
بلکہ اسی لاہور میں پرورش پاتے رہے ہیں اس لئے لاہور کے متعلق ہمارے تجربات وسیع ہیں اور
اور غالباً اسی لئے آقائے مرتضیٰ احمد خاں نے ہم سے سفارش کی ہے کہ ہم حضرت پطرس کے
ان سوالات کا جواب دیں جو آپ نے اپنے مشہور و بے نظیر مضمون "لاہور کا جغرافیہ" میں
دریافت کئے ہیں اور جو یہ ہیں :-

۱۔ تمہیں لاہور کیوں پسند ہے مفصل لکھو۔
۲۔ لاہور کس نے دریافت کیا اور کیوں۔ اس کے لئے سزا بھی تجویز کرو۔
۳۔ میونسپل کمیٹی کی شان میں ایک قصیدہ مدحیہ لکھو۔

آقائے مرتضیٰ نے یہ اعلان بھی کیا ہے کہ وہ ہمارے جوابات پر ہمیں نمبر دیں گے اور نتیجہ یونیورسٹی کے نتائج کے ساتھ شائع کریں گے گویا ہمارے لئے یہ امتحان کا پرچہ ہے اور ہماری بدقسمتی سے یہ ایسا ہی پرچہ ہے جیسا کہ ۱۹۳۶ء کے بی اے کے امتحان کا "انگلش پیپر اے" اور جس کے متعلق اخبارات میں شور مچ گیا تھا کہ "انگلش پیپر اے" میں پرچہ مرتب کرنے والے نے محض اپنی قابلیت کا مظاہرہ کیا ہے اور طلبا کی محدود قابلیت کو ملحوظ نہیں رکھا۔ یہی شکایت ہمیں اپنے پرچے کے متعلق ہے اور ہم اس کے خلاف یونیورسٹی کے پاس فریاد کرتے ہوئے ملتجی ہیں کہ ممتحن صاحب پر یہ حقیقت واضح کر دی جائے اور انہیں تنبیہ کی جائے کہ وہ نمبر دیتے وقت خاص رعایت سے کام لیں۔ ورنہ اخبارات میں ممتحن صاحب کی سنگدلی کے خلاف ہنگامہ برپا کر دیا جائیگا اور ان ہزار ہا انجمنوں سے جو الیکشن کے دنوں میں جنم لے لیتی ہیں۔ درخواست کی جائیگی کہ وہ احتجاجی قرار دادیں منظور کر کے ان کی نقول یونیورسٹی۔ ڈپٹی کمشنر لاہور، آقائے مرتضیٰ حضرتِ پطرس اور سارے اخباروں کو ارسال کر دیں۔

بہرحال ہم سوالات کے حل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور اس کام کے لئے اس اصول پر کاربند ہوتے ہیں جو ہمارے ہیڈ ماسٹر مولوی فتح محمد خاں صاحب مرحوم نے ہمیں مڈل کا امتحان دیتے وقت بتایا تھا۔ آپ نے فرمایا تھا کہ جب تمہیں پرچہ ملے تو تمام سوالات کو غور سے پڑھو اور جو سوال سب سے آسان نظر آئے اس کا جواب پہلے لکھو۔

ہمیں مذکورہ بالا سوالات میں ۲ نسبتاً آسان نظر آتا ہے۔ اس لئے پہلے اسی سے نمٹتے ہیں۔

سوال ہے کہ "لاہور کس نے دریافت کیا؟ اس کے لئے سزا بھی تجویز کرو"۔

لاہور کے دریافت ہونے کے متعلق مختلف روایات ہیں۔ جناب امیر علی شاعر حکیم

کی بیاض سے پتہ چلتا ہے کہ آج سے پچیس تیس سال پہلے لاہور کو طاعون نے دریافت کیا تھا جناب منور خاں ساغر اکبرآبادی کے روزنامچے اور "انتخاب لاجواب" کی فائلوں سے معلوم ہوتا ہے کہ لاہور کو ۱۹۱۰ء میں مولانا ظفر علی خاں نے دریافت کر کے اخبار "زمیندار" کو یہاں منتقل کر لیا تھا۔ سرتاج ٹوڈیاں جناب گوہری کی ڈائری میں مندرج ہے کہ لاہور کو سر مائیکل اوڈوائر اور لفٹنٹ کرنل فرینک جانسن نے مشترکہ طور پر دریافت کیا تھا اور ان کی غرض یہ تھی کہ ایک نئے خطۂ زمین کو تشددانہ دفتری اقتدار کا تختۂ مشق بنا سکیں۔ حضرت اپطرس کے ملفوظات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اصل لاہور کا آج تک پتہ نہیں چلتا۔ کیونکہ اس کے شمال مشرق، جنوب مغرب میں لاہور ہی لاہور واقع ہے۔ دوسرے الفاظ میں گویا لاہور ابھی تک دریافت ہی نہیں ہوا۔

تاریخِ پنجاب مصنفہ لالہ کنہیا لال سے اتنا تو پتہ چلتا ہے کہ لاہور مدت سے دریافت ہو چکا ہے اور وہ ایک سرکلر روڈ سے گھرا ہوا ہے۔ لیکن اس کے اندرونی حالات ہمارے خیال میں غالباً محکمۂ اطلاعات کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔

کہتے ہیں کہ سرکلر روڈ ایک ایسے شہر کا احاطہ کئے ہوتے ہے۔ جسے کُش کے بھائی لو نے بسایا تھا اور آج کل اس کے انتظام پر ایک مجلس مامور ہے جسے بلدیہ کہتے ہیں۔ لیکن اسی بلدیہ کے طفیل لاہور کے داخلی کوائف معلوم کرنا ناممکنات میں سے ہو رہا ہے

سُنا جاتا ہے کہ وہ لاہور جس کا ذکر لالہ کنہیا لال نے اپنی تاریخِ پنجاب میں کیا ہے۔ اب تک وہیں ہے۔ جہاں لوہ یا لاہو کے زمانے میں تھا لیکن اس کے داخلی حالات بلدیہ کی عنایتوں سے گل بکاؤلی کے اس قلعہ سے ملتے جلتے ہیں جو کچھ عرصہ ہوا جنوبی ہند کے ایک جنگل میں دریافت ہوا تھا مثلاً قلعۂ گل بکاؤلی کی طرح شہر کے چاروں طرف ایسی دلدلیں موجود رہتی ہیں کہ انہیں عبور کرنے کے لئے لاٹ صاحب کے ہاتھی کی سواری لازمی ہے۔ ورنہ دلدلوں

میں جو حشرات الارض پرورش پا رہے ہیں ان کی فوجیں داخلہ کو ناممکن بنا دیتی ہیں۔ لاٹ صاحب کا ہاتھی آج کل پبلک سے ناراض ہے۔ اس لئے اس کی مدد حاصل نہیں کی جا سکتی۔ سننے میں آیا ہے کہ گوالمنڈی کانگریس کمیٹی کے صدر لالہ کرم چند جی "مدیر پارس" نے اس مہم کو اپنے ذمے لیا تھا اور جس طرح وہ سواری کے لئے مولوی صاحب کا گھوڑا اکثر مانگ لیا کرتے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے ایک راجہ صاحب کا ہاتھی مانگنے کی کوشش بھی کی تھی تاکہ اس پر سوار ہو کر دلدلیں عبور کریں اور لاہور کے اندرونی حالات معلوم کر کے اپنے اخبار میں بھی چھاپیں اور اُن کی نقول رائل جغرافیکل سوسائٹی "وائڈ ورلڈ" اور دیگر جغرافیائی اداروں اور اخباروں کو ارسال کریں۔ لیکن راجہ صاحب نے ہاتھی دینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ "بھئی تمہاری کانگریس تو ہمارا تاج و تخت چھیننے پر آمادہ ہے۔ ہم کس طرح تمہیں اپنا ہاتھی دے دیں؟ اور اگر بفرض محال دے بھی دیا تو کون کہہ سکتا ہے کہ تم اسے بحقِ کانگریس ضبط نہ کر لو گے اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے لئے مثال قائم نہ کر دو گے۔" لالہ جی اپنے قصد سے باز آئے اور آج کل حضرت سندباد جہازی اس مہم کو ہاتھ میں لے رہے ہیں۔

دلدلیں عبور ہو بھی جائیں تو اس کے بعد دوسری کٹھن منزل جس کا ذکر "المصائب الثورہ فی بلدیۃ اللاہورہ" کے مصنف نے کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ بلدیہ لاہور نے شہر کے اندر خاص انتظامات کے ذریعے مچھروں کی اتنی بڑی جمعیت بھرتی کر رکھی ہے کہ وہ ہر ایسے شخص پر جو لاہور کے اندر داخل ہونا چاہے۔ بے تابانہ حملہ کرتی ہے اور داخلہ کو ناممکن بنا دینے کے لئے جان تک لڑا دیتی ہے۔ اس کے علاوہ جرمنی کی اشک آور گیس کی طرح شہر کے اندر ایک خاص قسم کی بدبو نالیوں اور بدررؤں میں ہمیشہ تیار ہوتی رہتی ہے۔ اگر کوئی شخص ایسے وقت میں لاہور کے اندر داخل ہونے کی کوشش کرے۔ جبکہ مچھروں کی فوج استراحت کر رہی ہو۔

تو یہ بدبُو مقابلہ کرتی ہے اور "صدر بلدیہ زندہ باد" کے نعرے لگاتی ہوئی دُشمن پر ٹوٹ پڑتی ہے ایسے موقعوں پر بلدیہ والے وائسرائے کی طرح اپنے خاص آرڈی ننینس جاری کرتے ہیں اور انجمن خاکروبانِ لاہور کی تمام سرگرمیاں کو قطعاً خلافِ قانون قرار دیدیا جاتا ہے۔

کتاب "اصفہان نصف جہان اگر لاہور نباشد" کے ایرانی مصنف نے لکھا ہے کہ لاہور کے کوچہ و بام سے ایک قسم کی زہریلی گیس ہر وقت آسمان کی طرف اُٹھتی نظر آتی ہے دھوئیں کی طرح غلیظ ہونے کے باعث نظر آسکتی ہے۔ اس کا اثر یہ ہے کہ کوئی پرندہ جو پرواز کرتا ہوا لاہور شہر کے اُوپر پہنچ جاتے۔ اس گیس کی زد میں آجاتا ہے۔ اس کا دم گھٹ جاتا ہے۔ اور چشم زدن میں بیہوش ہو کر زمین پر جا گرتا ہے۔ پروفیسر گلشن رائے کا خیال ہے کہ یہ وہی گیس ہے جو مہابھارت کی جنگ میں استعمال کی گئی تھی۔

کچھ عرصہ ہوا۔ سویڈن کے ایک طیارے نے جو ہندوستان سے گذر رہا تھا لاہور کے اُوپر پرواز کرنے کا کام اپنے ذمّہ لیا۔ جہاز ران اور اس کے معاونین نے آکسیجن کی بڑی مقدار ساتھ رکھ لی اور چہروں پر "ماسک" (MASKS) پہن لئے۔ اس کافی حفظِ ماتقدم کے باوجود طیارہ پانچ منٹ سے زیادہ لاہور کے اوپر پرواز نہ کر سکا۔ جہاز ران مدہوش ہونے لگا اور اس نے بعجلت تمام طیارہ کو اس میدان میں اتار دیا جسے منٹو پارک کہتے ہیں۔ ڈاکٹری امداد کے بعد جب اہلِ طیارہ کے اوسان بجا ہوئے اور اخبار نویسوں نے انہیں گھیر لیا تو سویڈنی ہوابازوں نے بیان دینے سے انکار کر دیا۔ بہر حال سویڈن پہنچکر اُنہوں نے ایک طویل بیان شائع کرایا۔ سویڈنی جہاز ران کے بیان کے مطابق اُس نے چند منٹ کے عرصہ میں جو کچھ دیکھا۔ وہ حیرت انگیز تھا۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے لاہور کے اندر انسان بھی چلتے پھرتے دیکھے اور مجھے حیرت ہے کہ ایسی گیس کے ہوتے ہوتے جو میرے دماغ کو اتنی بلندی پر معطّل

کر رہی تھی۔ یہ لوگ کس طرح زندہ ہیں؟

لاہور کے حالات دریافت کرنے کا مسئلہ اب بین الاقوامی حیثیت اختیار کر رہا ہے اور لنڈن کے اخبار "لنڈن نن سینس" ( NONE SENCE ) نے اپنی تازہ اشاعت میں امید ظاہر کی ہے کہ چونکہ لاہور کے اندر داخل ہونے کے زمینی وسائل وہاں کی بلدیہ کی مہربانی سے مقطوع ہیں سلئے آسمانی ذرائع اختیار کئے جائیں گے اور اس سلسلہ میں کوہ ہمالیہ کی مہم پر جانے والے بہادروں نے فیصلہ کیا ہے کہ اگر وہ ماؤنٹ ایوریسٹ کی سیر و تفریح کے بعد زندہ رہ سکے تو یورپ واپس جانے سے پہلے لاہور کا معائنہ کریں گے۔ ان کا ارادہ ہے کہ وہ ہوائی جہازوں پر سوار ہو کر لاہور کے اندر داخل ہوں اور دوسری دفعہ جان پر کھیل کر لاہور اور بلدیہ لاہور کے طلسماتی حالات معلوم کریں اور انہیں دنیا پر ظاہر کر کے نوبل پرائز حاصل کریں جو خود سویڈن کے ہوا باز کو اس لئے نصیب نہ ہو سکا کہ اسکی "دریافت" نامکمل تھی۔

لاہور کا وجود درایتہً و روایتہً ثابت ہے۔ لیکن اس کے باوجود بعض لوگ اس حقیقت سے منکر ہیں اور اس کی دریافت کے لئے سرگرداں ہیں چنانچہ یہی جنون لیکر ہمارے محترم معمار الملت جناب عزیز ہندی امرتسر سے تشریف لائے ہیں اور شاہی مسجد کو رسدگاہ بنا کر وہاں مقیم ہو گئے ہیں۔ آپ کا خیال ہے کہ لاہور کسی زمانے میں موجود ضرور تھا اور اس میں ملت اسلامیہ بستی تھی۔ لیکن انقلاب زمانہ نے شہر اور ملت دونوں کو تباہ کر دیا۔ اب شہر زمین کے برابر ہو چکا ہے اور ضرورت ہے کہ اس خطہ زمین کو دریافت کیا جائے جہاں لاہور موجود تھا اور وہاں ایک نیا لاہور تعمیر کر کے نئی ملت اسلامیہ بسائی جائے۔ آپ شاہی مسجد کے میناروں پر سے لاہور کے کھنڈروں کی دیکھ بھال میں مصروف ہیں اور ایسی دوربین استعمال کر رہے ہیں جو چاند اور تاروں کے لئے مخصوص ہے۔ حضرت معمار الملت کا خیال ہے کہ وہ ایک نئے لاہور اور نئی ملت

کی تعمیر میں کامیاب ہو جائیں گے اور یہ کہ آپ جلیبا نوالہ باغ کی نسبت لاہور کو زیادہ قابلِ توجہ سمجھتے ہیں۔

بہر حال اگر معمار الملت نے لاہور دریافت کر لیا تو ان کے لئے ہم سزا تجویز کریں گے جو غالباً یہ ہو گی کہ انہیں افغانستان پہنچا دیا جائے[1]۔

جہاں تک ہماری رائے کا تعلق ہے لاہور مدت سے دریافت ہو چکا ہے اور جہاں ہم رہتے ہیں وہ بالکل لاہور ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم اس سے بیزار ہیں اور اپنے دوستوں سے کہا کرتے ہیں کہ اے کاش! لاہور دریافت نہ ہوا ہوتا۔

# پنجاب کونسل ہال

حضرت پطرس کا دوسرا سوال یہ ہے کہ "تمہیں لاہور کیوں پسند ہے؟ مفصل لکھو!" جواباً عرض ہے کہ:۔

لاہور کی کیا بات ہے۔ لاہور لاہور ہی ہے۔ ہر شخص اور شخصنی کو پسند ہے اور ہمیں تو بہت ہی پسند ہے۔

لاہور کی نئی عمارتیں دیکھو تو سبحان اللہ! مداخلتِ بے جا کرنے کو جی چاہتا ہے اور پرانے وقتوں کی عمارتیں، اللہ اکبر! بقولِ حضرت سالک بٹالوی کہن سالی کے باوجود اب تک "تاج" نظر آتی ہیں یعنی تاج محل آگرہ۔

بعض لوگوں کو لاہور اس لئے پسند ہے کہ یہاں شاہانِ مغلیہ کے آثار عجائب خانہ،

---

[1] جناب عزیز ہندی کو سیاسی وجوہ کی بنا پر افغانستان جانے کی اجازت نہیں۔

چڑیا گھر، اسلامیہ کالج، عرب ہوٹل وغیرہ قابل دید مقامات ہیں یہیں بھی ان آثار قدیمہ وجدید کے قابل دید اور باصرہ نواز ہونے کا اعتراف ہے لیکن لاہور کے متعلق ہماری واقفیت عام لوگوں کی نسبت ذرا وسیع ہے اور ہم بعض ایسے مقامات بھی جانتے ہیں جو ہمارے نزدیک زیادہ قابل دید ہیں۔

عوام الناس کے نزدیک لاہور میں صرف ایک عجائب خانہ ہے جو کہ یونیورسٹی ہال کے سامنے واقع ہے لیکن ہمیں پوچھو تو یہاں کئی عجائب خانے ہیں مثلاً "پنجاب کونسل ہال"

یہ عجائب خانہ "اس وقت دیکھنے کے قابل ہوتا ہے جب تقدیر پنجاب کے فرشتے ہماری تہبین ہیں رد و بدل یا کمی بیشی کرنے کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ ان کے مجمع پر نظر دوڑاؤ، تو طوفان نوح کے بعد سے لے کر عہد حاضر تک کے طرز معاشرت کے نمونے موجود ہوتے ہیں۔ اس مجمع میں آپ کو اُس عہد تاریک کی جھلک بھی نظر آجائے گی جبکہ حضرت انسان نے ابھی تک دھات کو دریافت نہ کیا تھا اور لوہے کے اوزار قینچی اُسترہ وغیرہ ایجاد نہ ہوئے تھے اور پھر موجودہ ترقی یافتہ زمانے کے نمونے بھی ملیں گے جبکہ ظاہری شکل وشباہت میں مرد و زن کے امتیاز کا صفایا ہو رہا ہے۔ لباس کے معاملہ میں بھی آپ کو تن پوشی کی تمام ارتقائی منازل کے نمونے ملیں گے۔ دھوتیاں جو اُس زمانے کی یادگار ہیں جبکہ ابھی سوئی تک کی ایجاد نہ ہوئی تھی۔ چوڑی دار پاجامے، کھدر کی دار پگڑیاں، سہرے دار عمامے، طرہ دار صافے، ترکی ٹوپیاں، گاندھی ٹوپیاں، انگریزی ہیٹ وغیرہ۔ بعض کا لباس ہمارے تصور کو پچھلے زمانے کی طرف لے جاتا ہے اور بعض کے بالوں کی تراش خراش اور بوٹ سوٹ دیکھکر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات ابھی ابھی ولایت سے بن کر آ رہے ہیں۔

مختصر یہ کہ انسان کی تاریخ معاشرت کے اتنے آثار آپ کو کسی میوزیم حال میں نہ ملیں گے۔

جتنے کونسل ہال میں موجود ہوتے ہیں۔

اور جب اجلاس شروع ہوتا ہے تو ماشا اللہ ایسی ایسی دلچسپ حرکتیں دیکھنے میں آتی ہیں اور ایسے ایسے لطائف بیان ہوتے ہیں کہ اگر ان کی تفصیلات حاصل کر کے کتابی شکل میں ہر سال چھاپ دی جایا کریں تو یقیناً یہ کتاب "شب زفاف" سے بھی زیادہ فروخت ہو جائے مثلاً ایک دفعہ ایک لالہ جی کے پاس ایک ظریف طبع میاں صاحب بیٹھے تھے۔ لالہ جی پرانی وضع کے آدمی تھے تنگ پاجامہ پہنے ہوئے تھے اور آزار بند کو بقدر مرتبہ لٹکائے ہوئے تھے۔ میاں صاحب کو دل لگی جو سوجھی تو آہستہ سے اپنا پاؤں لالہ جی کے آزار بند کے سرے پر رکھ دیا جو زمین بوس ہو رہا تھا اور کہا کہ لالہ جی اٹھئے اور مقرر کے لب لہجہ کے خلاف احتجاج کیجئے میں تائید کر دوں گا۔ لالہ جی بڑی پھرتی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے لیکن جس سرعت کیسا تھ کھڑے ہوتے تھے۔ اسی عجلت کے ساتھ پھر بیٹھ گئے کیونکہ پاجامہ گر کر گھٹنوں پر آ رہا تھا

ایک دفعہ "قرطاس ابیض" پر بحث ہو رہی تھی تو ایک زندہ دل رکن نے کہا "ہم کالے آدمی۔ ہمارے صدر صاحب بالکل کالے آدمی اور نیا قانون بھی کالا۔ پھر میں حیران ہوں کہ اس کاغذ کا نام "سفید کاغذ" کس مناسبت سے رکھا گیا ہے؟

بجٹ پر بحث ہوئی اور شراب کے محاصل کا سوال سامنے آیا تو ایک صاحب نے کہا کہ "شراب کا نرخ بڑھا دیا جائے"۔ دوسرے نے کہا "گھٹا دیا جائے"۔ تیسرے صاحب بول اٹھے "شراب پینا ممنوع قرار دیا جائے" ایک مسلمان رکن چلائے "ایسا ہرگز نہ کیا جائے۔ شراب کی ممانعت سے سرکار کے خزانہ عامرہ کو نقصان برداشت کرنا پڑے گا"۔ دوسرے مسلمان بزرگ پکار اٹھے "ہوش کی باتیں کرو۔ مسلمان ہو کر حرام چیز کی حمایت، شرم چاہیئے"۔ ایک طرف سے آواز آئی "ارے بھائیو! میری بھی سنو، خزانہ پُر کرنا ہے تو مذہبی جھگڑوں میں نہ پڑو۔ بلکہ تمام ارکان متحد و متفق ہو کر بلا لحاظ مذہب و ملت خود پیا کرو

دور چلے دور چلے ساقیا          اور چلے اور چلے ساقیا

اس پھبتی پر کونسل ہال تالیوں سے گونج اُٹھا۔

اب خواہ آپ "کونسل ہال" کو عجائب خانہ کہیں یا چڑیا گھر لیکن آپ کو معترف ہونا پڑیگا کہ ایک بے نظیر چیز ہے۔

# بلدیہ لاہور

لاہور کا ایک اور عجائب خانہ "ایوانِ بلدیہ" ہے جو ہمیں بہت پسند ہے۔ بلدیہ کیا ہے ہم طالبانِ علم اللسانیات کیلئے ایک "اورینٹل کالج" ہے جس میں حنگر محلے، موچی دروازے، ہٹی بازار، میوہ منڈی، سبزہ منڈی، ہیرا منڈی وغیرہ مشہور مراکز زباندانی کی "السنۂ لاہوریہ" کسی معاوضے کے بغیر سیکھی جاسکتی ہیں۔ ارکانِ بلدیہ جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو وہی شُستہ زبان استعمال کرتے ہیں بحث پر اُتر آئیں تو بڑے بڑے ٹھوس اور بے نقط الفاظ میں گفتگو ہوتی ہے اور اکثر اوقات مسئلہ زیر بحث کو چھوڑ کر محض خدمتِ زبان کی خاطر مدِ مقابل کی "سیجین کی غلط کاریاں" سلیس زبان میں گنوائی جاتی ہیں

لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ بلدیہ میں ذوقِ سلیم رکھنے والے اصحاب کا فقدان ہے بلکہ یہ حقیقت ہے کہ وہاں بڑے بڑے باذوق حضرات بھی موجود ہیں چنانچہ ایک صاحب ایسے ہیں جنہیں فواکہات سے خاص لگاؤ ہے۔ وہ اجلاس میں جاتے ہیں تو کوئی قسم کے پھل ہمراہ لے جاتے ہیں۔ ادھر کسی مسئلہ پر گرما گرم بحث جاری ہوتی ہے اور ادھر یہ بزرگوار اپنے دائیں بائیں والے ممبروں میں کیلے سنگترے تقسیم کرنے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ "ادھر بھی دیجیئے"۔ "ہم بھی بیٹھے ہیں" کی آوازیں بلند ہوتی ہیں اور اجلاس میں ایسا شور مچ جاتا ہے گویا پیر صاحب کی نیاز تقسیم ہو رہی ہے

ایک دفعہ شراب کے ٹھیکوں کا مسئلہ درپیش تھا کہ اُن حضرت نے پھل تقسیم کرنے شروع کر دیئے۔ ایک غوغا سا مچ گیا۔ صاحب صدر نے انہیں ڈانٹا لیکن چوہدری صاحب بڑے موقع شناس واقع ہوئے ہیں انگور دل

کا ایک گچھا لیکر یہ صاحب صدر کی طرف بڑھے اور ان کے سامنے رکھکر بولے "لیجئے! آپ ناراض کیوں ہوتے ہیں؟"

ایک طرف سے آواز آئی ؎

تاک را سیراب سازد اے ابرِ نیسانِ بہار　　قطرہ تا مے "اندشد چرا گوہر شود؟

ممبروں نے گردنیں موڑ کر دیکھا کہ یہ فارسی خوان "ممبر کون ہے لیکن معلوم ہوا کہ یہ صاحب رکن بلدیہ نہ تھے بلکہ ایک تماشائی تھے۔

بلدیہ لاہور کے ماتحت رفاہِ عامہ کیلئے ایک بڑا دار التجارب قائم ہے جس میں مختلف امراض کی تشخیص و تحقیق کیلئے بڑے وسیع انتظامات کئے گئے ہیں اس لیبارٹری کے انچارج ہیلتھ آفیسر صاحب ہیں اور انکا خیال ہے کہ ہر بیماری کے مریض کو ایسے جراثیم کے خون کا ٹیکہ لگانا چاہیئے جو اسی مرض کا باعث ہوں چنانچہ اس نظریہ کے ماتحت سردست امراضِ مختلفہ پیدا کرنے والے جراثیم کی پرورش کا انتظام کیا گیا ہے اور اس کیلئے مختلف مراکز تجویز کئے گئے ہیں مثلاً ملیریا وغیرہ کے سلسلہ میں مچھر پالنے کے بڑے بڑے مرکز قائم ہیں جن میں گمٹی شاہو اور مصری شاہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ان مراکز میں مچھروں کی پرورش بڑے وسیع پیمانے پر کی جارہی ہے اور ایسے ذرائع استعمال کئے گئے ہیں کہ زہریلے سے زہریلے اور دُمدار مچھر پیدا کئے جائیں اور اس غرض کیلئے جابجا غلیظ پانی کے جوہڑ بنا دیئے گئے ہیں اور پانی کو خوب سڑنے دیا جاتا ہے تاکہ مچھروں کے علاوہ دیگر حشرات الارض بھی پیدا ہوسکیں جو دار التجارب کے لئے مفید ثابت ہوں۔

تپدق اور دیگر متعدی امراض کے جراثیم بھی پالے جارہے ہیں اگرچہ گذشتہ ماہ ستمبر کے آخری ہفتہ میں تپ دق کے باعث شہر میں دس موتیں واقع ہوگئی تھیں لیکن بلدیہ والوں کا بیان ہے کہ یہ نقصانِ جان اس فائدہ کے مقابلے میں کچھ حقیقت نہیں رکھتا جو بلدیہ کے دار التجارب کے طفیل آئندہ حاصل ہونے والا ہے۔

بلدیہ والے ایک اور تجربہ بھی بڑی دلسوزی کے ساتھ کر رہے ہیں۔ وہ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ عفونت کس درجہ تک پہنچکر انسان کیلئے مہلک ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ اس غرض کیلئے غلاظت کے کئی مراکز قائم کئے گئے ہیں اور لوگوں کو اجازت دی گئی ہے کہ وُہ بدررؤں اور نالیوں میں پیشاب کر کے حتی الامکان زیادہ سے زیادہ عفونت پیدا کریں تاکہ تجربہ جلد اور صحیح طور پر پایۂ تکمیل کو پہنچ سکے۔ ان مراکز میں قابلِ ذکر "موتن گلی" ہے جو انارکلی چوک کے قریب واقع ہے۔

برتھ کنٹرول (ضبطِ تولید) کے سلسلہ میں بھی عجائب خانہ بلدیہ کا دارالتجارب قابلِ قدر خدمات انجام دے رہا ہے۔ اس شعبہ کے انچارج ایگزکٹو افسر ہیں اور اپنے کام میں کافی تجربہ رکھتے ہیں۔ وہ اس نظریہ کے حامی نہیں کہ عمل تولید و تناسل کی سرے سے ابتدا ہی نہ ہونے دی جائے بلکہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ حاملہ عورت کے اسقاطِ حمل کے ذریعے سلسلہ تولید بند کیا جائے۔ چنانچہ آپ نے اس غرض کیلئے خاص خاص مراکز قائم کر رکھے ہیں۔ جہاں اسقاطِ حمل بڑی آسانی سے ہو جاتا ہے یعنی مختلف سڑکوں پر التزاماً ایسے ایسے نشیب و فراز اور گڑھے پیدا کئے گئے ہیں کہ عورت کا پاؤں پھسلے اور معاملہ ختم۔ لیکن سردست یہ مقام عورتوں کے لئے صرف بارش کے ایام میں ہی مفید ہو سکتا ہے اور کوشش کی جا رہی ہے کہ خشک موسم میں بھی اس سے فائدہ حاصل کیا جا سکے۔

دارالتجارب بلدیہ کے مفصّل حالات لکھنے کے لئے ایک کتاب کی ضرورت ہے۔ بہر حال مذکورہ بالا مثالوں سے واضح ہو گیا ہوگا کہ عجائب خانہ بلدیہ میں کیا کیا عجائبات بھرے پڑے ہیں اور کون شخص ہے جو لاہور کو ان خوبیوں کے ہوتے ہوئے ناپسند کرتا ہو؟

# شجرِ تسلیم

لاہور کا ایک اور عجائب خانہ جس کے باعث ہمیں لاہور پسند ہے باغ بیرون دہلی دروازہ ہے جو عین دفتر "احسان" کے سامنے واقع ہے۔ یہ باغ نہ صرف ہمیں پسند ہے بلکہ پولیس کو بھی بہت پسند ہے چنانچہ اسی لئے آج کل وہاں پولیس کی جھونپڑیاں تعمیر ہوگئی ہیں۔

پولیس کو تو شاید یہ جگہ اس لئے پسند ہے کہ یہاں رہ کر ایک اخبار کا دفتر انکی بندوق کی زد میں آجاتا ہے اور اس کے ایڈیٹروں کی مرمت گوروں کے ڈنڈوں سے بآسانی کیجا سکتی ہے لیکن ہمیں یہ باغ اس لئے پسند ہے کہ یہاں مسلمانوں کے جلسے ہوتے ہیں اور ان جلسوں میں ایسے ایسے عجائبات ظہور میں آتے ہیں کہ اسے عجائب خانہ کی بجائے طلسمی باغ کہنا زیادہ موزوں ہے۔

اس باغ میں ایک بڑا سا درخت ہے جس کے متعلق لوگ کہتے ہیں کہ سنبل کا درخت ہے۔ لیکن ہمیں اس کا یقین نہیں آتا۔ کیونکہ جب ہم اُن اشعار کو ذہن میں لاتے ہیں جو

زُلفِ محبوب کو سُنبل سے تشبیہ دی جاتی ہے تو ہمیں یقین نہیں آتا کہ یہ سُنبل کا درخت ہے۔ کیونکہ اس کا قطر تقریباً چھ فٹ ہوگا اور ہم نے آج تک کسی معشوق کے متعلق یہ نہیں سُنا کہ اسکی زلف کا قُطر چھ انچ بھی ہو۔

بہر حال اس درخت کے متعلق ایک بات پر ضرور ایمان رکھتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ یہ درخت طلسماتی درخت ہے اور مرزا سعید بیگ ماہرِ زراعت کی تحقیق کے مطابق اس کا جدّ امجد وُہی درخت تھا جس پر ایک دیو کسی شہزادی کو بٹھا کر حکم دیا کرتا تھا کہ چلو راجہ اندر کے دربار میں اور درخت اپنی "سواریوں" کو لیکر آناً فاناً راجہ اندر کے دربار میں پہنچ جاتا تھا اور جب دربار برخاست ہو جاتا تو شہزادی اور ایک درویش جو چوری سے ہر شب درخت کی جڑوں سے لپٹ جایا کرتا تھا۔ دونوں پھر اسی باغ میں آپہنچتے تھے جو اس درخت کا وطنِ مالوف تھا۔

اس درخت میں یہ بھی خصوصیت ہے کہ اس کے زیر سایہ جو جلسے منعقد ہوتے ہیں ان کے شرکا آن کی آن میں کہیں کے کہیں جا پہنچتے ہیں لیکن جب آنکھ کھُلتی ہے تو اسی باغ میں موجود ہوتے ہیں۔

"مقرر کہتا ہے "فلسطین میں عربوں کو تنگ کیا جا رہا ہے یہودی وہاں قبضہ جما رہے ہیں فلسطینی عرب ہمارے دینی بھائی ہیں اگر یہودی ان کا ملک خالی نہیں کریں گے تو ہم ہندوستان کے مسلمان انہیں ملک بدر کرنے کے لئے جائیں گے۔ کیا اے لاہور کے مسلمانو! تم جاؤ گے؟

حاضرین متفق اللسان ہو کر زور سے پکارتے ہیں "بے شک" مقرر کہتا ہے "جو مسلمان جانا چاہتے ہیں، ہاتھ اٹھائیں"۔

مقرر کے سوا ہر شخص ہاتھ اٹھاتا ہے! اللہ اکبر کے نعرے بلند ہوتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ مجمع ابھی اُٹھکر فلسطین کی طرف روانہ ہو جائے گا۔ حاضرین میں جوش پھیل جاتا ہے اور

درخت کی کرامات سے ان کے دل اس طرح فنا فی الفلسطین ہو جاتے ہیں کہ گویا وہ فلسطین پہنچ گئے ہیں لیکن جب جلسہ برخاست ہوتا ہے تو وہ جھٹ فلسطین سے واپس آجاتے ہیں اور سینما کا رُخ کرتے ہیں۔

دُوسرا مقرر تقریر کرتا ہے کہ "میں آج حکومت کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں ہر طرح کی قربانی دینے کے لئے تیار ہو کر آیا ہوں اور سچ پوچھئے تو پھانسی کے تختہ پر چڑھنے آیا ہوں"

حاضرین میں سے ہر شخص اس تختے کی طرف غور سے دیکھنا شروع کر دیتا ہے جس پر مقرر کھڑا ہوتا ہے۔ پھر لوگوں کی نگاہیں درخت کی شاخوں کی طرف اُٹھتی ہیں کہ شاید اس کے گلے میں ڈالنے کیلئے اُوپر سے کوئی رسی لٹکائی جاتی ہے لیکن ایسا نہیں ہوتا جس کا باعث یہ ہے کہ درخت نبل کی طلسماتی قوت تمام حاضرین کی "نظر بندی" کر دیتی ہے اور انہیں دوسری دُنیا میں پہنچا دیتی ہے پھر مقرر صاحب کو اس جہان سے پھانسی کے بغیر دوسرے جہان میں لے جاتی ہے تاکہ قربانی کا حق بھی ادا ہو جائے اور بال تک بھی بیکا نہ ہو۔ اس کے بعد درخت "قربان شدہ" مقرر اور حاضرین کو پھر اپنی اپنی جگہ پر لے آتا ہے اور مؤخر الذکر دیکھتے ہیں کہ مقرر ابھی تک تقریر کر رہا ہے "مسلمانو! اتفاق بڑی چیز ہے ـــــ"

مولینا سید عطاءاللہ شاہ نے ایک دفعہ اس باغ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ "اس باغ میں مَیں نے اور دُوسرے لیڈروں نے جو کچھ کہا۔ وہ سب اس درخت کو یاد ہے۔ یہ ہمارا گواہ ہے کہ ـــــ"

ہم شاہ صاحب کے ان الفاظ سے اندازہ لگاتے ہیں کہ آج کل جو پولیس اس باغ میں ڈیرے ڈالے ہوئے ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ درخت سے دوستی گانٹھ کر اس سے لیڈروں کی سب باتیں اُگلوائے اور ہمیں یقین ہے کہ پولیس اس میں کامیاب ہو سکے گی کیونکہ

بعض لیڈروں کی مسلسل صحبت نے اسے "موقع شناس" بنا دیا ہے۔

اس باغ میں اور اس درخت کا ایک کمال اور ہے۔ وہ بھی سنیئے:۔

فرض کیجئے کہ یہاں بڑا عظیم الشان جلسہ منعقد ہے اور ایک صاحب تقریر کر رہے ہیں مسئلہ زیرِ بحث یہ ہے کہ نیا آئین قبول کرنا چاہئے یا اسے مسترد کر دینا چاہئے۔ مقرر اپنے دلائل پیش کرنے کے بعد حاضرین سے پوچھتا ہے "کیا آپ ایسے فضول آئین کو قبول کرنے کے لئے تیار ہیں؟" شور مچ جاتا ہے "ہرگز نہیں، ہرگز نہیں"

آدھ گھنٹے کے بعد دوسرے مقرر صاحب آئینِ جدید کے حق میں تقریر کرتے ہیں اور آخر میں حاضرین سے پوچھتے ہیں "کیا تم ایسے مُفید آئین کو قبول نہیں کرو گے؟"

سب لوگ یکزبان ہو کر کہتے ہیں "ضرور کریں گے، ضرور کریں گے"

اس کے بعد ایک تیسرے صاحب اپنے دلائل پیش کر کے پوچھتے ہیں کہ "کیا پہلے دونوں حضرات بیوقوف نہیں؟" جواب ملتا ہے "بے شک!"

ہمیں باغ بیرونِ دہلی دروازہ اور اس کے طلسماتی درخت کی یہ آخری "کرامت" بھی بہت پسند ہے چنانچہ جب ہمیں کسی کو کوئی بات منوانا ہو تو ہم اسے اس "شجرِ تسلیم" کے نیچے لے آتے ہیں اور ہماری درخواست کا جواب ملتا ہے "بے شک" ۔

---

# اخباری عجائب

ایک اور بات جس کے لئے ہمیں لاہور پسند ہے۔ وہ یہ ہے کہ لاہور اخبارات و رسائل کا ایک بےنظیر عجائب خانہ ہے۔ جس میں ہر سائز، ہر زبان، ہر پالیسی، ہر رنگ اور ہر قیمت کے اخبارات و رسائل موجود ہیں۔ حتیٰ کہ "اخبار عام" بھی اب تک جی رہا ہے۔ جس کی عمر کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کا رجسٹرڈ ایل نمبر ۱ ہے اور اس کے مالک جن کے والد بزرگوار نے یہ اخبار جوانی کے عالم میں نکالا تھا۔ اب ضعیف العمر ہیں۔

عربستان کی "مردم شماری" کی طرح لاہور کے اخبارات و رسائل کی "پرچہ شماری" بھی نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ جس طرح بادیہ گرد عرب قبائل آج ایک جگہ خیمہ زن ہیں اور کل غائب۔ اسی طرح اخبارات و رسائل کی دُنیا بھی آنی جانی ہے۔ کل تک ایک اخبار یا رسالہ نکل رہا تھا تو آج اسی جگہ چلا گیا ہے۔ جہاں سے آیا تھا۔ اس لئے ان کے صحیح اعداد و شمار کا ریکارڈ رکھنا دشوار ہے۔ کہتے ہیں کہ سرکار کے رجسٹروں میں اخبارات و رسائل کے متعلق اعداد و شمار موجود رہتے

ہیں لیکن ہمیں ان کی صحت کا یقین نہیں، کیونکہ ہمارے سامنے ایسے واقعات موجود ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ سرکار کا رجسٹر بلدیہ کے "رجسٹر پیدائش و اموات" سے کسی صورت بہتر نہیں۔ مثال کے طور پر ایک واقعہ عرض ہے کہ ہمارے ایک دوست کو اپنے ہفت روزہ اخبار بند کئے کئی ماہ گزر چکے تھے کہ وہاں کے ڈپٹی کمشنر کی ایک چٹھی موصول ہوئی جس میں لکھا تھا کہ آپ کا پرچہ نہیں پہنچتا۔ گویا یہاں تو اخبار کی "ششماہی" بھی آچکی اور اب "سالانہ عرس" کی تیاریاں ہیں لیکن ڈپٹی کمشنر صاحب کے نزدیک وہ ابھی تک "بقیدِ حیات" ہے اور محض غفلت شعاری کے باعث حضور کی قدم بوسی کیلئے حاضرِ خدمت نہیں ہو سکا۔

پچھلے دنوں حضرت سالک نے "انقلاب" میں ایک دلچسپ واقعہ لکھا تھا جس کا تعلق حکومت کے "رجسٹر مطبوعات" سے ہے۔ بات یہ تھی کہ مسلم پرنٹنگ پریس ایک کتاب چھاپنے کے مسئلہ پر غور کر رہا تھا کہ اس کتاب کا نام کسی نہ کسی طرح حکومت کے رجسٹر میں بخانہ "پیدائش" درج ہو گیا۔ کتاب ابھی تک کتمِ عدم سے وجود میں نہ آئی تھی کہ حکومت کی جانب سے پریس کو عتاب نامہ موصول ہوا کہ حسب قانون "مطبوعہ" کتاب کی دو جلدیں کیوں ارسال نہیں کی گئیں؟

جہاں تک "موجودہ اور مرحوم" اخبارات و رسائل کا تعلق ہے، حکومت کا یہ رجسٹر بلدیہ کے رجسٹر پیدائش و اموات سے ملتا جلتا ہے لیکن اس میں ایک ایسا خانہ بھی موجود ہے جو بلدیہ کے رجسٹر کو نصیب نہیں، یعنی اُن مطبوعات کا خانہ جو ابھی تک "بطنِ مادر" میں ہیں۔ اور عنقریب پیدا ہونے والے ہیں۔ ان ہونے والے اطفالِ صحافت کی فہرست اس قدر طویل ہے کہ ہمارے بعض احباب آٹھ آٹھ دس دس درخواستیں گزار چکے ہیں کہ ہمیں فلاں نام کا اخبار یا رسالہ نکالنے کی اجازت دی جائے۔ لیکن درخواست اس حکم کے ساتھ واپس آجاتی ہے کہ اس نام کے اخبار یا رسالہ کے لئے پہلے کسی صاحب نے اجازت حاصل کر رکھی ہے

آپ کوئی نیا نام تجویز کیجیے۔ شاعروں کے تخلص کی طرح آج کل نئے اخبار یا رسالہ کا نام تجویز کرنا بھی ایک عقدۂ لاینحل بن رہا ہے۔

بہر حال اخباروں اور رسالوں کی بقول شخصے "مردم شماری" سے قطع نظر لاہور انگلستانِ صحافت کے لنڈن یا مرزائیتِ اخبار نویسی کے قادیان کی حیثیت اختیار کر چکا ہے اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عجائبستانِ صحافت کے نوادر پر "سرچ لائٹ" ڈالی جائے

لاہور والوں کی اپنی زبان تو پنجابی ہے لیکن ان کے اخبارات کی زبان عام طور پر اُردو ہے حتیٰ کہ جو اخبار اُردو زبان کی مخالفت بڑی شد و مد کیساتھ کر رہے ہیں۔ وہ بھی اُردو ہی میں شائع ہوتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان میں سے بعض کی زبان توتلی ہے اور بعض خونِ مادری کے جوش میں "ہندو پُت رکھشک" ایسے عنوان لکھکر اُردو کو "شدھ" کر لیتے ہیں۔

لاہور سے انگریزی اور ہندی زبان میں بھی کئی اخبار نکلتے ہیں لیکن صوبہ کی اصلی زبان کی لاج رکھنے کا فخر حاصل ہے تو ہمارے سکھ بھائیوں کو جو عموماً پنجابی زبان میں اخبار نکالتے ہیں اور سچ پوچھو تو خوب لکھتے ہیں ہمیں لاہور کے ایک گورمکھی اخبار کا ایک شاہکار اب تک یاد ہے۔ بات یہ تھی کہ ایڈیٹر صاحب بیمار تھے اور انکی غیر حاضری میں اسسٹنٹ ایڈیٹر صاحب نے اخبار مرتب کر کے ایک معذرتی نوٹ ان الفاظ میں لکھا۔

"اسیں امید کردے ہاں کہ ساڈے سجن ایس پرچے دیاں کمزوریاں ولوں سانوں معاف کرن گے کیونکہ ایڈیٹر صاحب بیمار سن۔ تے میرے جیہے بدھو نے پرچہ تیار کیتا اے ساڈے سجن ایہہ سُن کے خوش ہوون گے کہ ایڈیٹر صاحب دا تاپ کل راتیں ایس طرحاں اُڈ گیا جویں کھوتے دے سر توں سنگ"

یعنی "ہم امید کرتے ہیں کہ ہمارے احباب اس پرچے کی کمزوریوں کیلئے ہمیں معاف کریں گے کیونکہ ایڈیٹر صاحب بیمار تھے اور مجھ ایسے ہیچمدان نے پرچہ مرتب کیا ہے ہمارے دوست یہ سنکر محظوظ ہوں گے کہ کل رات ایڈیٹر صاحب کا بخار اس طرح اُڑ گیا جس طرح گدھے کے سر سے سینگ"

مذکورہ بالا زبانوں کے علاوہ کبھی کبھی فارسی کا ایک آدھ اخبار بھی نکل آتا ہے اور اس میں پشتو کے مضامین بھی ہوا کرتے ہیں تاکہ ہینگ فروشانِ لاہور کے مفادِ ہینگی وسلاجینی و ثعلبی کا تحفظ ہو سکے لیکن ایسے اخبار کو لاہور کی ہوا راس نہیں آتی۔

حضرت سندباد جہازی چونکہ شنگھائی کی بندرگاہ میں ایک عرصہ دراز تک لنگر انداز رہے ہیں اور وہاں سے چینی زبان کے ماہر ہو آئے ہیں اسلئے جناب قرشی بیرتی کے ساتھ مل کر وہ چینی زبان کا ایک اخبار نکالنے کی فکر میں ہیں جو لاہور کی مسجد چینیاں سے شائع ہوا کریگا۔ قرشی صاحب چین کے صوبہ تنان میں اس اخبار کے بیشمار مسلمان خریدار پیدا کر لیتے ہیں اور وہاں کے ڈاک کے محکمے سے انتظام کیا گیا ہے کہ ہر پرچہ مکتوب الیہ کے پاس اگلے جہان ری ڈائریکٹ کر دیا جایا کرے۔

ملک فضل الٰہی قربان کا ارادہ ہے کہ وہ لاہور سے ایک روسی اخبار نکالیں اور افواہ ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو کے ورودِ لاہور پر قربان صاحب ان سے مل کر اس سلسلہ میں گفت و شنید کریں گے اور کوشش کریں گے کہ اخبار کو کانگرس کی سرپرستی حاصل ہو جائے۔

ترکی زبان کا کوئی اخبار نکلنے کا بھی بڑی حد تک احتمال ہے کیونکہ حاجی الغازی محمد زکریا صاحب ترک نے لاہور میں ترکی زبان کا ایک مکتب کھول رکھا ہے اور ممکن نہیں کہ ان کے تلامذہ میں کوئی صحافت زدہ نوجوان تکمیل تعلیم کے بعد لاہور سے ایک ترکی اخبار نہ نکالے اور حضور نظامِ دکن سے سرپرستی کا خواہاں نہ ہو۔

عرب ہوٹل کی بالائی منزل سے ایک عربی اخبار نکلنے کی افواہ بھی ہوٹل کی چائے کی طرح گرم ہے۔

الغرض تھوڑے ہی عرصہ میں لاہور کی ہی صحافت ہفت زبان بلکہ چہاردہ زبان ہونیوالی ہے اور انصاف سے کہئے کہ ہندو مہاسبھا کے سوا لاہور کی یہ زبانی" ترقیاں کسے پسند نہیں؟

# اخباری پالیسی

جس طرح گاندھی جی کی پالیسی عدم تشدّد اور آہنسا پر مود ھرما۔ انگریزی حکام کی پالیسی
ہندوستان میں خانہ جنگی پیدا کرنا۔ یہودیوں کی پالیسی اتحادِ عربیہ کو تباہ کرنا۔ پنڈت جواہرلال نہرو
کی پالیسی مزدوروں اور کسانوں کو خوابِ غفلت سے جگانا۔ پنڈت مالویہ کی پالیسی بنارس
یونیورسٹی کے ہندی مندر پر اُردو کی قربانی دینا۔ مولانا اسماعیل کی پالیسی ہر سال حج کرنا اور
چوہدری افضل حق کی پالیسی مسٹر ایل۔ سی۔ ڈی بین سابق ٹریفک منیجر لاہور کا تتبع کرنا ہے
اسی طرح اخبارات کی بھی اپنی اپنی پالیسی ہے۔

آپ کہیں گے کہ مسٹر ایل۔ سی۔ ڈی بین کی پالیسی کیا تھی؟ گذارش ہے کہ صاحب بہادر نے
ذیل کے اعلان ریل کے ڈبوں میں چسپاں کرا رکھے تھے جواب بھی مختصر صورت میں موجود ہیں:۔

## تمباکو نوشی

اگر کوئی شخص سوائے اس گاڑی یا خانہ کے جو اس کام کے لئے خاص طور پر

دیا گیا ہو کسی گاڑی یا خانہ میں بغیر رضامندی اپنے ہمراہی مسافروں کے جو اسی گاڑی یا خانہ میں ہوں تمباکو نوشی کرے گا تو وہ سزائے جرمانہ کا مستوجب ہوگا جو پچاس روپے تک ہو سکتی ہے۔ اگر کوئی مسافر کسی ریلوے ملازم کے منع کرنے کے باوجود تمباکو نوشی کرے گا تو وہ ریلوے ملازم اس کو گاڑی سے نکال سکتا ہے۔

دستخط ایل سی۔ ڈی بین ٹریفک مینجر
"نارتھ ویسٹرن ریلوے"

چوہدری افضل حق بھی تمباکو نوشی کے حق میں پنجاب کے مسٹر ایل سی۔ ڈی بین ہیں۔
لاہور میں ہر پالیسی کے اخبار نکلتے ہیں مثلاً ہندوؤں میں بعض ایسے دھاسبھائی اخبار ہیں جن کی پالیسی فرقہ پرستی کو درجہ کمال تک پہنچانا ہے۔ ایسے اخبار کے ایڈیٹر کو اگر یہ خبر ملے کہ موچی دروازہ کے باہر دو بلیوں میں جھڑپ ہو گئی تو وہ اس خبر کو اپنے اخبار میں اس طرح درج کرے گا:-

## موچی دروازہ کے باہر زبردست ہندو مسلم فساد

### مسلمانوں کی خفیہ سازش کا خوفناک نتیجہ

## مسلمان بلی کا غریب ہندو بلی پر قاتلانہ حملہ

لاہور یکم جون۔ موچی دروازہ لاہور کے باہر ایک زبردست اور سنسنی خیز ہندو مسلم فساد ہونے کی اطلاع ملی ہے۔ واقعات اس طرح بیان کئے جاتے

ہیں کہ شاہ عالمی دروازہ کی ایک غریب ہندو بنی موچی دروازے کے باہر جا رہی تھی کہ ایک مسلم بنی نے مچھلی والے کی دکان سے نکل کر اس پر دفعتہ قاتلانہ حملہ کر دیا اور ناخنوں کے تیز اسلحہ کا آزادانہ استعمال کیا۔ پولیس کی آمد سے فساد رک گیا اور پولیس نے مسلمان بنی کو زیر حراست کر کے ہندو بنی کو ہسپتال پہنچا دیا۔ جہاں اس کی حالت نازک بیان کی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ حملہ مسلمانوں کی خفیہ سازش کا نتیجہ ہے اور خطرہ ہے کہ مسلمان پولیس معاملہ کی تحقیقات میں جانبداری سے کام لے گی۔"

مسلمان اخبارات میں بھی بعض ایسے ہیں جن کا "اسلام" ہر وقت خطرہ میں رہتا ہے بعض ہندو مسلم اخبارات کی پالیسی بلیک میلنگ ہے۔ ان اخبارات کے ایڈیٹر خارجی ممالک کے قونصل خانوں، راجوں اور نوابوں کے درباروں اور روساء و شرفاء کی کوٹھیوں کا طواف کرتے دیکھے جاتے ہیں۔ ان میں مندرجہ ذیل قسم کی خبریں درج ہوتی ہیں:-

## اعلیٰحضرت بچہ سقہ کو امیر المومنین تسلیم کر لیا گیا

## عہدِ سقائی کی برکات، ملک میں امن و سلامتی کا دور دورہ

کابل۔ (بذریعہ ڈاک) ہمارا نامہ نگار خصوصی متعینہ کابل اطلاع دیتا ہے کہ شہری اور قبائلی افغانوں نے اعلیٰحضرت بچہ سقہ کو امیر المومنین تسلیم کر لیا ہے۔ آپکی تخت نشینی بڑی دھوم دھام سے عمل میں آئی اور آپ کا نام اعلیٰحضرت امیر المومنین سلطان محمد حبیب اللہ خاں غازی رکھا گیا ہے۔ اعلیٰحضرت نے زمامِ حکومت ہاتھ میں لیتے ہی تمام امورِ سلطنت کی طرف شخصی توجہ دینی شروع

کردی ہے اور ہر شعبہ میں ایسی اصلاحات عمل میں آ رہی ہیں کہ ان کی مثال تاریخ افغانستان میں نہیں ملتی۔ ملک کے طول و عرض میں ہر طرف امن و امان کا دَور دَورہ ہے اور سرحدی قبائل کے ملک کابل میں آ آ کر اعلیٰحضرت کی بیعت کر رہے ہیں۔"

یا

# ایک مہاراجہ نے اپنے ایک افسر کی خوبصورت لڑکی کو محل میں داخل کر لیا

## دو سو پری پیکر دوشیزگان کے باعث شاہی محل رشکِ پرستان

## راج محل کے سنسنی خیز حالات

دہلی۔ ۱۰ مارچ۔ ایک مہاراجہ نے کس طرح اپنے ایک افسر کی سولہ سالہ خوبصورت لڑکی کو زبردستی محل میں داخل کر لیا اور کس طرح مہاراجہ کا محل دو سو پری پیکر دوشیزگان کے وجود سے رشکِ پرستان بن رہا ہے۔ یہ ایک سنسنی خیز داستان ہے۔ جس کی تفصیلات ہمیں حال ہی میں خاص ذرائع سے موصول ہوئی ہیں اور جنہیں ہم کسی آئندہ اشاعت میں ہدیہ ناظرین کریں گے۔"

ایسے اخبارات "آئندہ اشاعت" کی دھمکی دیکر بہت روپیہ کماتے ہیں۔ لیکن کہتے ہیں کہ حرام کی کمائی میں برکت نہیں ہوتی۔ ہم نے ان کے گھروں کی حالت جب بھی دیکھی حضرت میر مرحوم کی نظم "گھر کا حال" یاد آ گئی اور ان ایڈیٹروں کو یہی کہتے سنا ؎

قصہ کوتاہ وقت کھوتا ہوں　　　رات کے وقت گھر پہ ہوتا ہوں

بعض اخبارات ایسے بھی ہیں۔ جن کی پالیسی حاجی لق لق کے مضامین کی طرح "برائے فروخت"

ہوتی ہے اور جسے ہر وقت خریدا جا سکتا ہے۔ ان اخبارات کے ایڈیٹر زمانے کے ساتھ ساتھ چلنے کے قائل ہیں اور ان کا اصول یہ ہے کہ اخبار کی پالیسی کو زمانے کے ساتھ بدلتے رہنا چاہئے۔

لاہور میں روزانہ اخبار بھی بہت ہیں اور ہفت روزہ بھی، ہفتہ میں دو بار شائع ہونے والے بھی اور پانزدہ روزہ بھی، ماہانہ بھی اور سالانہ بھی، کئی سال کے بعد چھپنے والے بھی اور ایسے بھی جو چھپتے نہیں بلکہ بورڈ پر صرف ان کا نام لکھا رہتا ہے۔

یورپ میں ایسے اخبار بھی موجود ہیں جو ایک دن میں کئی بار چھپتے ہیں لیکن لاہور میں اس کے برعکس ایسے اخبار موجود ہیں جن کی ایک ایک اشاعت میں کئی کئی دن چھپتے ہیں۔ یہ اخبار برقی خبریں پہنچانے والی ایجنسیوں کی خدمات حاصل نہیں کرتے۔ اس لئے ایڈیٹروں کو ایک روز کی اشاعت میں کئی دن کی خبریں دوسرے اخباروں سے نقل کر کے پرچہ مرتب کرنا پڑتا ہے اس لئے ان کی اشاعت میں کئی "دن" چھپتے ہیں جو بجائے خود ایک خصوصیت ہے۔

اخبارات کے علاوہ لاہور سے ماہانہ رسالے مختلف زبانوں میں اور سینکڑوں کی تعداد میں شائع ہوتے ہیں۔ ان میں اخلاقی بھی ہیں اور معاشرتی بھی، زرعی بھی اور تجارتی بھی، طبی بھی اور ڈاکٹری بھی، صنعتی بھی اور فلمی بھی، ادبی بھی بے ادبی بھی۔ ان کی پالیسی یہ ہے :۔

## چندہ سالانہ

| | |
|---|---|
| عوام سے .. .. .. .. | تین روپے |
| رؤسا سے .. .. .. | پچاس روپے |
| والیان ریاست سے .. .. | ریاست کا نصف مالیہ |
| ابن سعود سے .. .. | حج کی دعوت ! |
| بادشاہوں سے .. .. .. | شکریہ کی چٹھی |

بہر حال ہمیں اخبارات و رسائل کی کثرت کے باعث لاہور بہت پسند ہے۔ کیونکہ اگر ہمیں یہاں کسی قسم کی ملازمت نہ ملے تو ہم گھر بیٹھے اپنے مضامین بیچ بیچکر گذر اوقات کر سکتے ہیں۔

## بلدیہ کا قصیدہ

حضرت پطرس کے سوالات میں سے ایک یہ ہے کہ بلدیہ کی شان میں قصیدہ لکھو ہم نے دوسرے سوالات کے حل کرنے میں اتنا وقت گزار دیا ہے کہ اس اثنا میں بلدیۂ لاہور معطل ہو گئی ہے اب ہم نہ اس کا قصیدہ لکھ سکتے ہیں نہ ہجو۔ اس لئے اسی مصرعہ پر اکتفا کرتے ہیں ؎

خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنیوالی ہیں

# یحییٰ آفندی کے دانت

یحییٰ آفندی کو ہنسنے کا بہت شوق تھا۔ اگر کوئی اس سے کہتا کہ "آفندم، موصل میں طاعون پھیل گئی ہے۔" تو وہ اپنے چہرے کو افسوسناک بنانے کی بجائے ہنس دیتا۔ اگر کوئی اس کو یہ خبر سناتا کہ "کمان افسر تمہیں ملازمت سے برخاست کرنے کی فکر میں ہے۔" تو غمزدہ ہونے کی بجائے اس کی باچھیں کھل جاتیں۔ اگر کوئی شخص غصے میں آ کر اس سے کہتا کہ "یحییٰ آفندی جہنم میں جاؤ" تو وہ دانت نکال کر کہتا۔ "اکیلا یا گھوڑے سمیت؟"

اُس کا ہنسنا اس کی قلبی کیفیت کا مظہر نہ ہوتا تھا بلکہ بات یہ تھی کہ حضرت کے بالائی دانت تمام کے تمام سونے کے تھے۔ جنگِ عظیم کے دوران میں جب کہ وہ کرنل لارنس کی فوج میں ترکوں کے ساتھ لڑ رہا تھا تو اس کے دانت میدانِ جنگ میں "شہید" ہو گئے تھے۔ جب لارنس دمشق میں داخل ہوا تو کپتان یحییٰ آفندی نے ایک فرانسیسی دندان ساز سے سونے کے دانت لگوا لئے تھے۔ وہ اپنے سنہری دانتوں پر بڑا فخر کیا کرتا تھا اور یہی باعث تھا۔

کہ وہ ہر بات پر خواہ اچھی ہو یا بُری ہنس دیتا تھا تاکہ لوگ اس کے سنہری دانتوں کو دیکھ کر اس کی امارت سے مرعوب ہو جائیں۔

میں اور یحییٰ آفندی گھوڑوں پر سوار ایک ایسے علاقہ سے گزر رہے تھے جسے تمدن کی ہوا تک نہ لگی تھی۔ ہمارے پیچھے دس کُرد سواروں کا ایک دستہ تھا اور ہم اپنی رسالہ فوج میں شامل ہونے کے لئے جا رہے تھے جو موصل سے دو سو میل کے فاصلے پر پڑی تھی۔

ہم جس گاؤں سے گزرتے تھے، دیہاتی لوگ بھاگ کر ہمیں دیکھنے کے لئے آتے تھے۔ اور جب قریب پہنچتے تھے تو یحییٰ آفندی کے دانتوں کی طرف ٹکٹکی لگا دیتے تھے۔ جو ان کے قریب آنے سے پہلے ہی ہنس ہنس کر مجھ سے باتیں کرنے لگتا تھا تاکہ اس کے دانت نظر آ سکیں۔

یحییٰ تو اپنی امارت کا مظاہرہ کر رہا تھا لیکن میری جان ہوا ہو رہی تھی۔ کیونکہ میں ان غیر متمدن دیہاتیوں کو بڑے شبہ کی نظروں سے دیکھتا تھا مجھے ان کی نگاہوں میں تحریص کے ساتھ بربریت بھی نظر آ رہی تھی اور میں ڈرتا تھا کہ کہیں یحییٰ آفندی کے دانت ہمیں کسی مصیبت میں مبتلا نہ کر دیں۔

آخر میں نے اس سے یہ بات کہہ دی اور درخواست کی کہ بھیا! تم بڑے امیر ہو۔ تمہارے سولہ دانت سونے کے ہیں تم عجائبات روزگار میں سے ہو لیکن خدا کے لئے دیہات سے گزرتے وقت مُنہ کو بند رکھا کرو۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی دانتوں کے لالچ میں آ کر "ڈز" کر دے میرا خیال تھا کہ یحییٰ "ڈز" کے تصور سے ڈر جائیگا اور پھر دانت نکالنے کی جرأت نہ کرے گا لیکن اُس نے ایک قہقہہ لگایا اور اتنا طویل قہقہہ کہ کئی لمحوں تک اس کے دانت نظر آتے رہے مجھے صرف اس علاقہ کے دیہاتیوں ہی سے خطرہ نہیں تھا بلکہ اپنے محافظ سپاہیوں کا

ڈر بھی تھا کیونکہ میں ان کی نظروں میں بھی خیریت نہیں دیکھتا تھا اور پانچ سال سے کہ دودھ میں رہنے کے باعث مجھے بخوبی علم تھا کہ وہ ایک روپے کے لئے انسان کو ہلاک کر دینے کے عادی ہیں یہ تو سونے کے سولہ دانت ہیں۔

میں نے انہیں ایک دفعہ ایسی باتیں کرتے بھی سن لیا تھا جن میں یحییٰ آفندی کے قتل کی سازش کہنا چاہتے۔ لیکن مجھے متوجہ دیکھ کر اس صفائی سے بات کو بدل دیتے تھے کہ مجھے ان پر الزام لگانے کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی تھی۔

ایک رات ہم ایک جنگل میں ڈیرے ڈالے ہوئے تھے کہ آدھی رات کے وقت مجھے کچھ مشکوک نقل و حرکت محسوس ہوئی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ دیکھا کہ ایک سپاہی بندوق تھامے دبے پاؤں سوتے ہوئے یحییٰ آفندی کی طرف بڑھ رہا ہے جونہی میں اٹھ کر بیٹھا سپاہی بھاگ کر میرے پاس آیا اور بولا " باش کاتب صاحب (ہیڈ کلرک۔ میں اس فوج کا ہیڈ کلرک تھا) دیکھو جنگل میں شیر کی آنکھیں چمک رہی ہیں" میں نے اس طرف نگاہ کی جس طرف وہ انگلی سے اشارہ کر رہا تھا۔ مجھے کوئی چمک دکھائی نہ دی لیکن میں نے یونہی کہہ دیا " ہاں ہاں ——— وہ ہے" پھر ایک لمحے کے بعد بولا " آنکھیں غائب ہو گئی ہیں۔ شاید شیر بھاگ گیا ہے"!

میں نے اپنے وفادار چاوش (حوالدار) کو جگا دیا اور کہا کہ پہرہ دو ——— اس جنگل میں شیر ہیں لیکن میں نے اگلی صبح یحییٰ آفندی سے اس واقعہ کا ذکر کیا تو اس نے حسبِ معمول ایک ٹھیل قہقہہ لگایا اور کہا " آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ احمد قاسم نے ضرور ہی شیر دیکھا ہوگا"

اب ہم پہاڑی علاقہ سے گزر رہے تھے جو گذشتہ علاقوں کی بہ نسبت زیادہ غیر متمدن تھا ہم ایک گاؤں میں پانی پینے اور خوراک کی اشیاء لینے کے لئے ٹھہرے تو گاؤں کے زن و مرد ہمارے گرد جمع ہو گئے۔ ان کی نظریں پچھلے علاقوں کے دیہاتیوں سے کہیں زیادہ مشکوک

تھیں۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ یہ لوگ بڑھ بڑھ کر یحیٰی آفندی کے ہاتھ کو بوسے دے رہے تھے میں اس بات کو بھی شبہ کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ کیونکہ مجھے یاد تھا کہ ضلع سلیمانیہ کے دیہاتیوں نے ایک دفعہ میرے ہاتھ پاؤں کو بوسے دینے کے بعد مجھے لُوٹ لیا تھا۔ لیکن میں نے انگریزی زبان میں جب اپنے شبہ کا ذکر یحیٰی آفندی سے کیا تو اس کی باچھیں پھر کھل گئیں اور اُس نے کہا "یُو فُول!"

اس علاقہ میں تین دن چلنے کے بعد ہمیں ایک بلند پہاڑ کی چڑھائی چڑھنی پڑی کئی گھنٹوں تک چلنے کے بعد ہمیں دور ایک گاؤں نظر آیا جس کے سفید مکان درختوں اور جھاڑیوں کی سبزی میں بہت بھلے معلوم ہوتے تھے۔ جب ہم گاؤں کے قریب پہنچے تو ہمیں نقارہ بجنے کی آواز سُنائی دی میں نے یحیٰی سے پوچھا "یہ کیا ہے؟" یحیٰی آفندی ہنس کر بولا "یہ خطرے کی گھنٹی۔ گاؤں کے پہرہ دار نے ہمیں دیکھ لیا ہے اور ہمیں دشمن سمجھ کر اہل دیہہ کو جمع کر رہا ہے۔"

مَیں۔ جمع کر رہا ہے تو پھر کیا ہے؟ ہم بارہ آدمی اعلےٰ درجہ کی انگریزی بندوقوں سے مسلح ہیں۔ ہم لڑیں گے۔

یحیٰی۔ ماشاءاللہ! آپ لڑیں گے لیکن آفندم یہ بھی معلوم ہے کہ اس علاقہ میں نہ صرف ہر زن و مرد کے پاس بندوق ہوتی ہے۔ بلکہ یہ کہ ہر گھر میں کئی کئی بندوقیں فالتو ہوتی ہیں۔"

مَیں۔ تو پھر واپس ہو چلیں۔"

یحیٰی۔ بے سود۔ گاؤں اتنی زیادہ دُور نہیں کہ وہ ہمیں نہ آلیں اور اب تو ہم ان کی بندوقوں کی زد سے باہر بھی نہیں رہے۔ ہم بھاگے اور گاؤں والوں نے فائر کیے۔ اسلئے بھگوڑوں کی موت مرنے سے لڑائی کرنا بہتر ہے ——— ہا ہا ہا ہا (قہقہہ)

مَیں۔ لیکن ممکن ہے کہ گاؤں والے ہم سے دوستانہ سلوک کریں۔

یحییٰ۔ یہ ہماری روش پر منحصر ہے۔

میں کچھ اور کہنے کو تھا کہ ہم گاؤں کے بالکل قریب جا پہنچے اور ہم نے دیکھا کہ ایک شخص جو گاؤں کا شیخ معلوم ہوتا تھا ہماری طرف آ رہا ہے۔ اس کے پیچھے صرف چار پانچ آدمی ہیں اور وہ بھی غیر مسلح۔

میں نے جلدی سے یحییٰ آفندی کو ہدایت کر دی کہ وہ مجھے کردی زبان سے ناآشنا ظاہر کرے اور یہ کہے کہ یہ ہندوستانی افسر صرف اپنی زبان اور انگریزی جانتا ہے۔ ساتھ ہی میں نے یہ کہا کہ دانت نکال کر جیب میں ڈال لو لیکن یحییٰ آفندی نے دانتوں کی بات سُنکر پھر قہقہہ لگایا۔

شیخ ہمارے قریب آیا۔ ہم گھوڑوں سے اُترے اور یحییٰ آفندی نے السلام علیکم کہکر مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ شیخ نے بڑے تپاک کے ساتھ مصافحہ کیا۔ اس کے بعد میری باری آئی میں نے گڈ مارننگ کہکر مصافحہ کیا اور شیخ نے خندہ پیشانی کے ساتھ کہا "وعلیکم السلام"۔ جب مصافحہ سے فارغ ہوا تو یحییٰ آفندی نے اپنے سپاہیوں کو کاشن دیا "پریزنٹ آرم"! اس پر سپاہیوں نے جو گھوڑوں سے اُتر چکے تھے شیخ کی جرنیلی سلامی اُتاری۔

شیخ ہمیں لیکر اپنی حویلی کیطرف بڑھا جہاں ایک بڑے کمرے میں ایک گڑھے کے اندر آگ کا انبار لگا ہوا تھا۔ ہمیں شیخ نے اندر داخل ہونے کے لئے کہا اور ہمارے سپاہیوں کو اس کے ملازمین کسی اور جگہ لے گئے۔ شیخ کے دو ملازموں نے ہمارے گھوڑے تھام لئے۔ لیکن یحییٰ آفندی نے کہا کہ میرا گھوڑا ہمیشہ میرے پاس رہنے کا عادی ہے۔ اس لئے اسے بھی اندر لے جایا جائے شیخ نے اس بات کو مان لیا۔ کمرہ بہت فراخ تھا۔ اس کے ایک طرف پردہ کے پیچھے غالباً شیخ کا حرم تھا اور دوسری طرف خالی تھی۔ وہاں یحییٰ آفندی کے گھوڑے کو باندھ دیا گیا اور میرے گھوڑے کو کسی نامعلوم جگہ پر پہنچا دیا گیا۔

ہم ایک قالین پر اپنے میزبان کے ساتھ بیٹھ گئے اور تھوڑے عرصہ کے بعد شیخ کی خوبصورت اور نوجوان لڑکی ہمارے لئے قہوہ لائی۔ ہم نے قہوہ پینا شروع کیا اور لڑکی ایک طرف بیٹھی یحییٰ آفندی کے دانتوں کو دیکھنے لگی شیخ کُردی زبان میں یحییٰ آفندی سے باتیں کر رہا تھا اور میں اس طرح بیٹھا تھا گویا ان کا ایک لفظ بھی نہیں سمجھتا۔ کبھی کبھی یحییٰ مجھ سے انگریزی میں بات چیت کر کے شیخ پر یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ شیخ کی گفتگو کا ترجمہ کر رہا ہے لیکن دراصل اس کا موضوع شیخ کی لڑکی تھا۔ لڑکی بڑی حریص نظروں سے یحییٰ کے دانتوں کی طرف دیکھ رہی تھی اور شیخ کی نگاہیں بھی مشتبہ تھیں۔ آخر شیخ نے پوچھا۔

شیخ۔ آپ کے دانت سونے کے کیونکر بن گئے؟

یحییٰ۔ میں حضرت اویس قرنی کی اولاد میں سے ہوں۔ جن کے دانت جنگِ احد میں شہید ہو گئے تھے۔ خدا نے حضرت اویس قرنی پر خوش ہو کر یہ رحمت فرمائی ہے کہ حضرت کے زمانہ سے لیکر آج تک آپ کی اولاد کے نرینہ بچوں کے دانت سونے کے ہوتے ہیں۔

شیخ نے تعجب کا اظہار کیا اور لڑکی نے یحییٰ کی طرف محبت کی نظروں سے دیکھا۔ یحییٰ قہوہ پی رہا تھا۔ لیکن جونہی اُس نے قہوہ کی پیالی کو جس میں ابھی نصف قہوہ موجود تھا۔ شیخ کی ایک بات کا جواب دینے کے لئے فرش پر رکھا۔ لڑکی نے اسے اُٹھا کر پی لیا۔ یہ دیکھکر شیخ نے ایک عجیب و غریب آواز نکالی اور کہا "اوہ کمبخت لڑکی"

یحییٰ نے یہ الفاظ کہنے کی وجہ پوچھی تو شیخ نے کہا کہ یہاں کے رواج کے مطابق آپ کا جھوٹا قہوہ پی لینے کا یہ مطلب ہے کہ لڑکی آپ سے شادی کرنا چاہتی ہے اور اب آپ بھی انکار نہیں کر سکتے۔ انکار کی سزا موت ہے۔"

"موت؟" یحییٰ نے کہا — اور مجھ سے انگریزی میں کہا "اب کیا کیا جائے — ؟" میں نے

کہا۔ "یہ سب دانت حاصل کرنے کی چالیں معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن اب ہاں کہنے کے سوا کیا چارہ ہے؟"

شیخ اس کا بھی یہ مطلب سمجھا کہ یحییٰ آفندی شیخ کی بات کا ترجمہ کرکے سمجھا رہا ہے۔ میں نے مسکرا کر اور شیخ کی طرف مخاطب ہو کر انگریزی میں ایک ڈبل گالی دی۔ یحییٰ نے اس گالی کا یہ ترجمہ کیا کہ "باش آفندی آپ کو مبارکباد کہتے ہیں۔"

شیخ کے اشارے سے دعوت کا سامان ہونے لگا اور رات کے وقت قاضی صاحب کو بلا کر نکاح کر دیا گیا۔ بڑے دھڑلے کی ضیافت ہوئی جس میں پندرہ بیس اکابر دیہہ شریک ہوئے آدھی رات تک محفل گرم رہی۔ اس کے بعد مہمان رخصت ہو گئے ادھر شیخ نے یحییٰ آفندی سے کہا کہ تمہیں حرم کے ایک کمرے میں اپنی بیوی کے پاس سونا ہوگا۔ لیکن کیا یہ بالکل صحیح ہے کہ آپ کی نرینہ اولاد کے دانت سونے کے ہوں گے؟ یحییٰ نے کہا۔ یقیناً! لیکن اس کا انحصار آپ کی بیٹی پر بھی ہے۔ اگر اسے مجھ سے سچی محبت ہے تو اس کے بیٹے کے دانت لازمی طور پر سونے کے ہوں گے۔ لیکن اگر محبت کسی غرض پر مبنی ہے، تو نہ صرف اس کی نرینہ اولاد سونے کے دانتوں سے محروم رہے گی۔ بلکہ میرے سنہری دانت بھی غائب ہو جائیں گے۔"

اس گفتگو کے بعد شیخ نے یحییٰ سے کہا کہ اٹھئے اور زنانہ میں چلئے۔ لیکن یحییٰ نے کہا کہ آپ چلئے میں گھوڑے سے کچھ باتیں کر لوں۔ یہ میری باتیں سمجھتا ہے اور میں اسے کہنا چاہتا ہوں کہ کوئی فکر نہ کرو۔ میں صبح ملوں گا۔

یہ سنکر شیخ پردے کے پیچھے چلا گیا اور یحییٰ گھوڑے کے پاس چند منٹ کے بعد وہ واپس آیا۔ شیخ پھر باہر نکلا اور اسے اندر لے گیا میں وہیں آگ کے پاس قالین پر دراز ہو گیا۔

صبح ہوئی تو یحییٰ میرے پاس آیا لیکن اس کے دانت غائب تھے۔ شیخ پردے سے باہر آیا اور اس نے غصہ میں آکر کہا "اب کیا ارادہ ہے اور تمہارے سُنہری دانت کیا ہوئے؟" یحییٰ نے کہا کہ تمہاری لڑکی کو مجھ سے سچی محبت نہ تھی۔ اس لئے دانت غائب ہو گئے۔ شیخ نے کہا۔ یہ سب دھوکا ہے اور تمہیں اس کی سزا ملے گی۔ اس کے بعد اُس نے دونوں اور پُورے کمرے کی ہر چیز کی تلاشی لی۔ اسے دانتوں کی تلاش تھی۔

ہمیں کمرے سے باہر نکالا گیا تو ہم نے دیکھا کہ ہمارے دس سپاہی بندوقوں کے بغیر کوئی دو سو آدمیوں کے نرغے میں کھڑے ہیں۔ شیخ نے ایک اشارہ کیا اور ایک جلاد ہاتھ میں خنجر لئے آگے بڑھا لیکن قبل اس کے کہ وہ یحییٰ پر وار کرے۔ شیخ نے کہا "ٹھہرو"۔ یہ کہکر شیخ کچھ سوچ میں پڑ گیا اور چند لمحوں کے بعد بولا "چونکہ تم ایک دفعہ میرے داماد بن چکے ہو۔ اس لئے میں داماد کے خون سے ہاتھ رنگنے نہیں چاہتا۔ جاؤ فوراً یہاں سے چلے جاؤ" ہمیں اپنے اپنے گھوڑے دیئے گئے۔ لیکن بندوقیں غائب کر دی گئیں۔ ہم فوراً سوار ہو کر بھاگے اور کئی میل تک ہم نے ایک دوسرے سے ایک لفظ تک نہ کہا۔ آخر جب ہم نے دیکھا کہ اب خطرے سے باہر ہیں تو میں نے یحییٰ سے کہا "عجب ماجرا گذرا" یحییٰ آفندی نے اس پر قہقہہ لگایا اور کہا "وُہ دانت کیسے لے سکتے تھے؟ شیخ کی لڑکی نے مجھے سوتا پا کر میرے دانتوں کو نکالنے کی کوشش کی لیکن وہاں کیا رکھا تھا؟" میں نے متعجب ہو کر پوچھا "دانت گئے کہاں؟" اُس نے گھوڑے کی دُم میں ہاتھ مار کر دانت نکالے اور قہقہہ لگا کر کہا "یہ ہیں دانت!"

# خفقان

کچھ عرصہ کا ذکر ہے کہ اصلاحِ خواتین کی تحریک زوروں پر تھی اور عورتوں کو بازار جانے سے روکا جا رہا تھا۔ انجمنِ ہدایتِ خواتین" کے علاوہ مسلمان مردوں کی کئی انجمنوں نے بھی اپنی مصروفیتوں کو اس کوشش پر مرکوز کر رکھا تھا کہ عورتیں خرید و فروخت کرنے کیلئے بازار میں نہ جائیں۔ اس کوشش کا یہاں تک اثر ہوا کہ سینما زدہ خواتین بھی ایسے سینما گھروں میں جانے لگیں جو کسی بازار میں واقع نہ ہوں یا جہاں جانے کیلئے بازاروں میں سے نہ گزرنا پڑے

میسرز بھلا مل پکوڑی لال جوہریوں کی دکان پر فرم کا سینیئر حصہ دار لالہ بھلا مل اپنے ملازم کچوری نند سے گفتگو کر رہا تھا کہ بھئی مسلمان بھی عجیب قوم ہے۔ یہ لوگ ہر چیز کو مذہبی رنگ دے لیتے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر "اسلام خطرے میں" کی صدائیں بلند ہونے لگتی ہیں۔ کوئی ان بھلے مانسوں سے پوچھے کہ عورتوں کے خود سودا سلف خریدنے میں کیا قباحت ہے؟ کپڑے اور زیور کے معاملہ میں عورت کو صرف اپنی ہی پسند کی چیز مطمئن کر سکتی ہے۔ اس لئے مردوں

کے سودا خریدنے سے گھر گھر لڑائی جھگڑے ہوتے ہوں گے۔

بھلامل کی یہ آخری بات درست تھی۔ کیونکہ اس کا ہم بھی تلخ تجربہ کر چکے تھے ہمیں گھر سے حکم ملا تھا کہ دو قمیصوں کے لئے ریشمی کپڑا لا دو۔ ہم نے جو زیادہ پیسے گھر سے نکلتے دیکھے تو سوچا کہ یہ اسراف بیجا کب تک ہمارے چولھے کو گرم رکھ سکے گا ؟ چنانچہ ہم نے انجمنوں کی تحریک سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور بازار سے چھ گز سوتی کپڑا لے آئے۔ گھر والوں نے حیران ہو کر پوچھا " یہ کیا ماجرا ہے۔ آپ سے تو ریشمی کپڑے کے لئے کہا گیا تھا " ہم نے اخبار نویسانہ شان سے کہا۔ " تمہیں اتنی بھی خبر نہیں کہ فلسطین میں بڑے زور و شور سے جنگ ہو رہی ہے۔ اس لئے جاپان نے ہندوستان کو ریشمی کپڑا بھیجنا بند کر دیا ہے " جواب ملا کہ ابھی کل کی بات ہے کہ ایک پھیری والا ریشمی کپڑے کی صدا دے رہا تھا۔ لیکن میں اس وقت مشغول تھی۔ اس لئے کپڑا نہ خرید سکی " ہم نے کہا " اری احمق! وہ حبشہ کے کارخانوں کا بنا ہوا کپڑا ہے۔ اس پر اب اطالیہ قابض ہے اور جانتی نہیں ہو کہ اطالیہ نے اس حبشہ پر جبراً قبضہ کر لیا ہے جس کے بادشاہ نجاشی نے نبی کریم کے زمانے میں مہاجرین اسلام کو پناہ دی تھی۔ کیا موذی اطالیہ کے کارخانوں کا مال خرید کر کافر بننا چاہتی ہو ؟ اے کاش کہ تم نے مسٹر چرچل کا وہ بیان پڑھا ہوتا جو اس نے دارالعوام میں علیحدگی برما کے متعلق دیا ہے "

اخباری رعب کا اثر تو کافی پڑا۔ لیکن آپ عورتوں کے مزاج سے واقف ہی ہوں گے جب کپڑے کی کوالٹی اور نرخ پر تنقید شروع ہوئی تو معاملہ بگڑ گیا اور دونوں طرف سے ایسی ایسی گوہر افشانیاں ہوئیں کہ سارے محلے نے ہمارا مکالمہ بڑی دلچسپی سے سنا۔

غرض لالہ بھلا مل نے کچوری نند سے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا " ذرا اس بات پر تو غور کرو۔ اگر عورتیں کپڑے کی دکان پر نہ جائیں تو چنداں مضائقہ نہیں کیونکہ پھیری والے

پارچہ فروش "خاں نوبل" والوں کی طرح گلی گلی میں پھرنے نکلتے ہیں اور عورتوں کو گھر بیٹھے ہر قسم کا کپڑا خریدنے کا موقع مل جاتا ہے۔ لیکن زیور خریدنے کے لئے وہ کیوں بازار میں نہ آئیں؟ یہ کیا ہی شرم کی بات ہے کہ مرد زیور خریدنے آتا ہے اور کان پھول کو اپنے کان میں لٹکا کر اور مونچھوں کو ہاتھ سے چھپا کر آئینہ میں دیکھتا ہے کہ زیور بھلا معلوم ہوتا ہے یا نہیں۔"

کھوری نند نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا۔" لالہ جی! اس مشکل کا حل یہ ہے کہ آپ مجھے ایک ٹوکرے میں چند زیور رکھ دیا کیجئے اور میں روزانہ گلی کوچوں میں صدائیں دیتا پھروں گا۔ "لے لو تازہ زیور!"

اب کے لالہ بھلا مل نے قہقہہ لگایا اور کہا۔" ہمارے کام میں ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ ہمارا مال بہت قیمتی ہوتا ہے اور ہم ہر کس و ناکس کو کوئی زیور دے نہیں سکتے کہ وہ اسے گھر لے جا کر پسند کرالائے۔"

بھلا مل نے جملہ ختم کیا ہی تھا کہ ایک ٹیکسی دکان کے سامنے آکر ٹھہری اور اس میں سے ایک برقع پوش خاتون نے نکل کر دکان کے اندر قدم رکھا اور سیدھی شیشے کی الماریوں کی طرف بڑھی جن میں سونے چاندی کے خوشنما زیور چمک رہے تھے۔ لالہ بھلا مل بھی پیچھے پیچھے ہولیا اور جب خاتون وسطی الماری کے سامنے ٹھہر گئی تو لالہ جی اس کے عین مقابل ہو کر بولے "حکم فرمایئے۔ کیا چاہیئے؟"

خاتون نے جو موٹر سے لے کر دکان تک اس کوشش میں مصروف نظر آتی تھی کہ کہیں اس کی انگلی بھی برقع کے باہر نظر نہ آئے۔ اب بیباکانہ نقاب الٹ دی۔ اس کی نگاہوں میں زیوروں کی چمک دمک سے چکاچوند چھا گئی اور ادھر لالہ جی کی آنکھیں خاتون کا چندے آفتاب و چندے ماہتاب چہرہ دیکھ کر خیرہ ہو گئیں۔ لالہ جی نے کچھ تو اپنے زیوروں کو

زیادہ نمایاں کرنے کے لئے اور کچھ پریزاد خریدار کے حسن و جمال کا لطف اُٹھانے کے لئے بجلی کی بتیاں روشن کردیں۔

خاتون ایک خاص عشوہ طرازی کے ساتھ بولی " لالہ جی جڑاؤ کانٹے دکھائیے۔ لالہ جی نے جھٹ الماری کھولی اور بیش قیمت کانٹوں کی جوڑی جو خوبصورت مخملی ڈبیہ میں دھری تھی۔ نکال کر سامنے رکھدی، خاتون نے ایک ایک کو اٹھایا، اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور قیمت دریافت کرنے کے بعد ایک اور زیور دکھانے کو کہا، وہ بھی حاضر کیا گیا۔ پھر تیسرا، پھر چوتھا اور پھر پانچواں خاتون پسندیدہ زیوروں کو ایک طرف رکھتی گئی اور لالہ جی سوچنے لگے کہ آج صبح کس بھاگوان کا منہ دیکھا تھا؛

خاتون کے کہنے پر لالہ جی نے تمام زیوروں کی میزان کی سواتین ہزار روپے بنے اور لالہ جی کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ منتظر تھے کہ خاتون بُرقعے کے اندر سے بٹوا نکال کر اور سو سو روپے کے نوٹ گن کر لالہ جی کے ہاتھ میں دے دیگی۔ لیکن خاتون نے مسکرا کر کہا " لالہ جی یہ زیور مجھے تو بہت پسند ہیں لیکن بہتر ہو کہ ڈاکٹر صاحب بھی دیکھ لیں میں ڈاکٹر رمضان کی بیوی ہوں اور وُہ آج بہت مصروف ہیں۔ اسلئے اگر آپ اپنا آدمی میرے ساتھ بھیجدیں تو پسندیدگی پر روپے بھجوا دیئے جائیں گے "

لالہ جی نے ذرا تامل کیا۔ لیکن خاتون نے ایک عجیب معشوقانہ انداز سے لالہ جی کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا " گھبرانے کی کوئی بات نہیں میں کوئی رہزن نہیں ہوں۔ ایک مشہور ڈاکٹر کی بیوی ہوں۔ آپ ڈاکٹر رمضان خاں کو جانتے ہیں ؟

ڈاکٹر رمضان خاں شہر کے ہر دلعزیز اور بہت قابل ڈاکٹر تھے پریکٹس کا یہ حال تھا کہ انہیں سینکڑوں روپے کی روزانہ آمدنی تھی۔ اس لئے ان کی بیوی کا ایک ہی دفعہ دس ہزار روپے

کے زیورات خرید لینا بھی عجیب بات نہ تھی۔ لالہ بھلا مل نے کچوری نند کو آواز دی اور کہا بیگم صاحبہ کے ساتھ جاؤ اور جو زیور پسند آئیں۔ ان کی قیمت لے آؤ!

لالہ جی نے اپنے ملازم کو ہر ایک زیور کی قیمت بتادی اور کچوری نند نے کھونٹی سے پگڑی اتار کر سر پر رکھ لی۔ جسے دیکھ کر خاتون کے چہرے پر اطمینان کی لہر دوڑ گئی کیونکہ کچوری نند پشاوری کلاہ اور لنگی باندھتا تھا اور پگڑی باندھے ہوئے بالکل مسلمان نظر آتا تھا۔

موٹر کار ڈاکٹر رمضان خاں کے مطب کے سامنے ٹھہری اور خاتون زیور لئے نیچے اُتری۔ اُس نے کچوری نند سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب بلائیں گے تو اندر آنا۔

تھوڑی دیر کے بعد کچوری نند کو ڈاکٹر صاحب کے ملازم نے اندر بلایا اور ڈاکٹر صاحب نے اسے کرسی پر بیٹھا کر اُس کے چہرے اور آنکھوں کی طرف غور سے دیکھنا شروع کر دیا پھر کہا "زبان نکالو!" کچوری نند حیران ہو کر بولا۔ "ڈاکٹر صاحب! میں مریض تو نہیں۔ آپکو مغالطہ ہوا ہے۔ میں تو زیور والا ہوں"

ڈاکٹر صاحب نے زیور کا نام سُنکر قہقہہ لگایا اور کہا "بس ٹھیک ہے تمہیں یہی بیماری لاحق ہے"۔ یہ کہکر ڈاکٹر صاحب نے اس کے دل کی حرکت دیکھنی شروع کر دی کچوری نند چیخ کر بولا "اجی ڈاکٹر صاحب! آپ کیا کر رہے ہیں۔ زیوروں کی بات کیجئے"

ڈاکٹر صاحب نے دو ملازموں سے کہا "اسے اُٹھا کر چارپائی پر لٹادو" نوکروں نے اسے دونوں بازوؤں سے تھام لیا اور کھینچنا شروع کیا۔ کچوری نند چلّانے لگا "یہ کیا کر رہے ہو۔ کیا زیور ہضم کرنے کا ارادہ ہے؟"

ڈاکٹر صاحب نے نوکروں سے مخاطب ہو کر کہا "پروا نہ کرو۔ لٹا دو اسے۔ بیچارے کو

مرض لاحق ہو گیا ہے خفقان کی قسم کا۔ اسکی بیوی کہتی ہے کہ ہر وقت زیور زیور کی رٹ لگاتا رہتا ہے۔"

کچوری نند گھبرا کر بولا "میری بیوی؟ میری بیوی کہاں ہے ؟" ڈاکٹر صاحب نے مسکرا کر کہا "گھبراؤ مت، ساتھ والے کمرے میں ہے۔ اُس کے سامنے تمہارا مرض زیادہ زور پکڑتا ہے اس لئے اس کی تجویز پر ہیں نے اُسے دُوسرے کمرے میں بھیج دیا ہے۔ شور نہ مچاؤ صبر سے کام لو تمہارا مرض انشاء اللہ جاتا رہیگا" ڈاکٹر صاحب نے ٹیکہ لگانے کی پچکاری نکالی۔

اب تو کچوری نند بہت پریشان ہوا اور بولا "ڈاکٹر صاحب! میں تو زیوروں کے دام لینے آیا ہوں اور ایشور کی کرپا سے تندرست ہوں۔ آپ کیا کر رہے ہیں ؟"

"ایشور کی کرپا سے ؟ کیا تم ہندو ہو؟"

"جی ہاں، بھولا مل پکوڑی لال کا ملازم ہوں۔ آپ کی بیگم صاحبہ سوا تین ہزار روپے کا زیور ہماری دکان سے لائی ہیں۔ ان کے دام چاہتا ہوں۔"

ڈاکٹر صاحب یہ سُن کر بھونچکا سے گئے اور گھبرا کر بولے "میری بیگم؟" یہ الفاظ کہتے ہی ڈاکٹر صاحب بھاگتے ہوئے دوسرے کمرے میں گئے کچوری نند اور ان کے ملازم بھی ان کے پیچھے دوڑے۔ لیکن اُنہوں نے ساتھ کا کمرہ خالی پایا۔ سب لوگ باہر کی طرف بھاگے خاتون کا کہیں نام و نشان نہ تھا اور موٹر کار بھی غائب تھی۔

# مہاتما گاندھی سے ماسٹر نثار تک

مہاتما کا نام کرم چند گاندھی مقام پیدائش ہندوستان ۔ صحیح تاریخ ولادت معلوم نہیں لیکن روایت ہے کہ کانگرہ غرق ہونے سے پہلے پیدا ہوئے اور اپنی بکری کی دعا و برکت سے جیتے چلے جا رہے ہیں ۔ ان کے جینے پر نہ لارڈ ارون یا لارڈ ولنگڈن کو اعتراض تھا اور نہ لارڈ لنلتھگو معترض ہیں ۔ پہلے بیرسٹر تھے پھر کانگرسی ہندوستان کے ڈکٹیٹر بنے اور اب ویلج اَپ لفٹ (گرام سدھار) ہیں یعنی "ٹر" ہر حال میں قائم رہی ۔ دنیا کی عظیم ترین ہستیوں میں شمار ہوتے ہیں اور امریکہ کے سینماؤں میں تو ان کی تصویر دیکھ کر تماشائی سروقد کھڑے ہو جاتے ہیں اور احترام کے طور پر سروں سے ٹوپیاں اُتار لیتے ہیں لیکن ہندوستان اپنے لیڈروں کی قدر کرنا نہیں جانتا ۔ یہاں "نوبت بہ ایں جا رسید" ہو چکی ہے کہ اگر مہاتما گاندھی ان کے سامنے آئیں تو لوگ اپنی ٹوپی اتارنے کی بجائے ان کی ٹوپی اُتارنے کے لئے کھڑے ہو جائیں ۔

لیڈری کا مرحلہ بھی "نجات المومنین" کے پل صراط کی طرح کچھ ایسا دشوار گزار ہے کہ ذرا پاؤں پھسلا اور گئے خصوصاً مسلمانوں میں تو لیڈری کا قضیہ کبھی طے ہی نہیں ہوا جس طرح خلافتِ اسلامیہ کا مسئلہ حضرت ابوبکر صدیق سے لے کر خلیفہ فضل الدین تک ہزارہا مخالفتوں اور خانہ جنگیوں کا میدان بنا رہا اسی طرح مسلمانانِ ہند کی لیڈری کا سوال بھی مولانا ابوالکلام آزاد سے لیکر الحاج امین الدین صحرائی تک رقیبانہ جدوجہد کی آماجگاہ بنا رہا ہے۔ اور شاید قیامت کی دس تاریخ تک جبکہ دریائے راوی کے کنارے پھر علمِ آزادی لہرایا جائیگا اسی حال میں رہے۔

لیکن یہ نہ سمجھ لیجیے کہ ہندوؤں میں لیڈری کو دائمی ہر دلعزیزی حاصل ہے۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ ان میں رواداری کا جذبہ موجود ہے۔ چنانچہ پنڈت جواہر لال نہرو جہاں مہاتما کی سیاسی پالیسی کو بہ نظرِ استحسان نہیں دیکھتے۔ وہاں مہاتما اور ان کی بکری کا ذاتی طور پر بہت احترام کرتے ہیں۔

مہاتما گاندھی ذات کے لحاظ سے سو فیصدی گائے بولنے والے ہندو ہیں اور بات نہیں رکھتے۔ کیونکہ وہ بکری کھا جاتی ہے۔ بہر حال ذات پات ہی کے جھگڑوں نے انہیں لیڈری کے تخت سے نیچے گرا دیا۔

عام ہندوؤں کی ماں "گئو ماتا" ہے۔ لیکن مہاتما جی بکری سے ماتا کا کام لیتے ہیں یعنی ہمیشہ بکری کا دودھ پیتے ہیں۔ آپ جب ولایت گئے تو "بکری ماتا" کو ساتھ لے گئے۔ وہاں انگریزوں کی موٹی تازی بکریاں دیکھ کر آپ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور انگریز حیرفا سے مخاطب ہو کر بولے :۔

" بھئی گدڑیا صاحب بہادر! ہم غلام اور مفلس قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسلئے

ہماری بکریاں دُبلی پتلی ہیں تم لوگ حاکم اور باثروت ہو۔ اسلئے تمہاری بکریاں بہت موٹی تازی ہیں۔"

ہم نے کئی اخبارات کے فائل چھان مارے۔ لیکن یہ پتہ نہیں چل سکا کہ اُن دنوں ہمارے موجودہ وائسرائے لارڈ لنلتھ گاؤ کہاں تھے۔ ہم اتنا جانتے ہیں کہ اگر وہ لنڈن میں ہوتے۔ تو گاندھی جی کی مندرجہ بالا مایوسانہ تقریر سنکر ضرور ان کی ڈھارس بندھاتے اور سکاٹ لینڈ کا ایک پہاڑی بکرا تحفتہً پیش کر کے عرض کرتے کہ لیجئے ہندوستانی بکریوں کی آئندہ نسل اب کمزور نہ رہے گی۔

ہمیں لارڈ لنلتھ گاؤ پر یہ حُسنِ ظن اس لئے ہے۔ کہ مویشیوں کی نسل کشی میں آپ بہت دلچسپی لیتے ہیں۔ آپ جب ہندوستان تشریف لائے۔ تو یہاں کی گئو ماتاؤں کی لاغری دیکھکر آپ کو بڑا صدمہ ہوا اور جھٹ ولایت سے عمدہ نسل کے چند سانڈ منگوا کر ہندوستانیوں کو تحفتہً پیش کر دیئے تاکہ ہندوستانی لوگ ان فربہ سانڈوں کی "خدمات" سے فائدہ اُٹھائیں۔

اس سلسلہ میں مہاراجہ پٹیالہ کی خوش ذوقی کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ انہوں نے جب دیکھا کہ وائسرائے بہادر نے ولایت سے سانڈ منگوائے ہیں تو فوراً خاص آرڈر بھیجکر وہیں سے چند گائیں بھی منگوالیں اور کہا۔ کہ لیجئے صاحب سانڈ بھی آپ کے اور گائیں بھی آپ کی معلوم ہوتا ہے کہ مہاراجہ صاحب گایوں کی اینگلو انڈین نسل بھی پسند نہیں کرتے

بہرحال لارڈ لنلتھ گاؤ کی فراخ حوصلگی میں شبہ نہیں ہو سکتا اور ہم تو یہاں تک کہتے ہیں کہ خدا جانے ان کے نام کے ساتھ یہ "لنلتھ" کیا ہے۔ آپ تو خالی "گاؤ" ہیں۔

امرتسر میں کسی زمانے میں ایک ڈپٹی کمشنر کنگو صاحب ہوا کرتے تھے۔ بڑے شریف نیکدل اور غریب پرور، اس لئے دیہاتی لوگ انہیں "گئو صاحب" کہا کرتے تھے لیکن ہمارے

وائسرائے بہادر تو حقیقی معنوں میں "گئو آما" ہیں۔ کیونکہ آپ شملہ کے سکولوں میں جا کر بچوں کو تازہ دودھ پلایا کرتے ہیں اور یہ رسم اس قدر بڑھ رہی ہے کہ شملہ اور دہلی کی بلدیات نے بھی مدارس بلدیہ کے طلباء کو دودھ پلانے کا فیصلہ کر لیا ہے اور دوسری بلدیات بھی ان کی تقلید پر آمادہ نظر آتی ہیں جس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ سانڈوں کے بغیر ہی یہ نئی قسم کی گائیں خود بخود پیدا ہونی شروع ہو گئی ہیں اور لارڈ لنلتھگو صاحب بہادر کے سانڈ تھان پر بندھے نوکری پہرہ دیئے بغیر پرورش پا رہے ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ بلدیہ لاہور آنجہانی بھی سکول کے بچوں کو دودھ پلانے کے مسئلہ پر غور کر رہی تھی اور میاں فیروز الدین احمد نے تجویز پیش کی تھی کہ یہ دودھ واٹر درکس کے نلوں کے ذریعے سکولوں تک پہنچایا جائے۔ کیونکہ اس طرح اس میں پانی کی ملاوٹ کا اندیشہ نہیں رہے گا۔

لیکن افسوس یہ ہے کہ بلدیہ کے ٹوٹ جانے سے یہ کام پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا اور لاہور اس "گئو ماتا" سے محروم ہو گیا۔ بہر حال ہمیں توقع ہے کہ ایڈمنسٹریٹر صاحب جو آج کل انتظامات بلدیہ کے انچارج ہیں۔ بلدیہ مرحومہ کی تجاویز کو عملی جامہ پہنائیں گے مثلاً بلدیہ لاہور خواجہ دل محمد روڈ کی تعمیر و مرمت کے مسئلہ پر غور کر رہی تھی جس کے متعلق سندباد جہازی نے لکھا تھا کہ وہاں بارش کے ایام میں پانی جا بجا مثلث، مربع، مخمس، مسدس، مثمن اور مدور شکلوں میں کھڑا رہتا ہے اور خواجہ دل محمد صاحب نے جو ریاضی کے پروفیسر ہیں۔ اس سڑک کی مرمت کی طرف بلدیہ کی توجہ اس لئے نہیں دلائی کہ آپ اسے طلباء کی تعلیم ریاضی کے لئے مخصوص رکھنا چاہتے تھے۔ ایڈمنسٹریٹر صاحب کو چاہئے کہ وہ اس سڑک کو درست کرا کے اس کا نام "دل محمد روڈ" کی بجائے "سندباد روڈ" تجویز کریں۔ کیونکہ اوّل تو اس لئے کہ اس کی مرمت کی طرف سندباد جہازی نے توجہ دلائی تھی۔ دوم یہ کہ خواجہ دل محمد صاحب

دل محمد روڈ کے نواح سے نقل مکانی کر کے سرکلر روڈ کے اُس ٹکڑے پر آگئے ہیں۔ جو اکبری دروازہ اور دہلی دروازہ کے درمیان واقع ہے اور جواب دوبارہ تعمیر ہو چکا ہے۔ صاحب بہادر چاہیں تو اس ٹکڑے کا نام دل محمد روڈ رکھ سکتے ہیں لیکن ڈر یہ ہے کہ ایسا کرنے سے خواجہ صاحب اس سڑک کو بھی تعلیم ریاضی کے لئے اپنے ڈھب کی نہ بنا لیں۔

سرکلر روڈ کا جو حصہ بل روڈ اور دہلی دروازہ کے درمیان واقع ہے اس کی حالت بہت خراب تھی۔ لیکن سندباد جہازی اور حاجی لق لق کے مضامین سے متاثر ہو کر بلدیہ نے اسے ازسرِ نو تعمیر کرا دیا تھا۔ اس لئے ہم ایڈمنسٹریٹر صاحب سے اس بات کے متوقع ہیں کہ وہ اُس ٹکڑے کے سرے پر یعنی دہلی دروازہ کے چوک میں ایک مجسمہ نصب کرائیں جس کے دو سر ہوں۔ ایک سندباد جہازی کا اور دوسرا حاجی لق لق کا۔ مجسمہ کے پیٹ میں وہ مشین لگا دی جائے جو یورپ کے بعض شہروں میں ٹریفک کے آہنی سپاہیوں کے اندر لگائی جاتی ہے اور جس کے ذریعے یہ لوہے کے آدمی ٹریفک کا انتظام قائم رکھتے ہیں۔ اس بُت کے چار ہاتھ ہوں جو مشین کے ذریعے چوک کے چاروں راستوں پر آنے جانے والی موٹروں اور تانگوں کی رہنمائی کریں۔ ہم ایڈمنسٹریٹر صاحب کو یقین دلاتے ہیں کہ اگر انہوں نے ہماری اس تجویز پر عمل کیا تو ہمارا بے زبان "بُت" ان بولتے چالتے بُتوں سے زیادہ رہنما ثابت ہوگا جو قومی پلیٹ فارموں پر ہاتھ ہلا ہلا کر اور گلا پھاڑ پھاڑ کر تقریریں کرتے ہیں اور ان کے ہاتھوں کی جنبش اور زبان کی طرّاری، قوموں کی رہنمائی کرنے کی بجائے ان کے تصادم کا باعث ہوا کرتی ہے اور پولیس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ ان ہنگاموں کے انسداد کے لئے بلدیہ کے باغوں پر مخالفانہ قبضہ جما کر اپنی جھونپڑیاں تعمیر کرے۔ ہمارا بُت چونکہ بے جان ہوگا۔ اس لئے رہنمائی کرتے وقت اس پر "مُردہ باد" کے نعرے لگائے جانے کا احتمال بھی نہ ہوگا۔

ہاں تو بات مہاتما گاندھی کی تھی جس میں لارڈ لنلتھ گاؤ کا ذکر ضمناً آگیا اور پھر آرہا ہے یعنی یوں کہ اگر انگلستان کے سارے انگریز لارڈ لنلتھ گاؤ کی قسم کے ہوتے تو ہندوستان کو اسی روز آزادی مِل جاتی جبکہ مہاتما گاندھی نے نمک بنایا تھا لیکن معاملہ یہ ہے کہ انگریز لوگ عموماً ہمیں اچھا نہیں سمجھتے ذرا خیال تو کیجئے کہ مہاتما گاندھی جن دنوں لنڈن پہنچے۔ انہی دنوں چارلی چیپلن بھی وہاں گئے اور انہوں نے خود مہاتما گاندھی کی قیام گاہ پر جا کر ان کے درشن کئے کیا یہ کوئی کم عزت ہے کہ دنیا بھر کو ہنسانے والا مشہور ایکٹر مہاتما کے درشنوں کی خواہش کرے، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ان دونوں مقتدر ہستیوں کا استقبال کس طرح ہوا ؟

چارلی چیپلن کے لنڈن جانے کی خبر مشہور ہوئی تو لنڈن کی بیشمار پری چہرہ دوشیزگان میں سے ہر ایک نے عہد کر لیا کہ وہ سب سے پہلے چارلی چیپلن کا منہ چومیگی۔ اس مسابقت کی دھن میں وہ لنڈن سے کئی کئی سٹیشن آگے نکل گئیں حتےٰ کہ جس لڑکی نے یہ معرکہ جیتا وہ بندرگاہ تک جا پہنچی تھی اور چارلی ابھی جہاز سے اُترا بھی نہ تھا کہ لڑکی نے چٹاخ سے اس کے مُنہ پر بوسہ دیا اور کہا "میں جیتی"۔

اب ہمارے گاندھی جی کی طرف دیکھئے کہ جونہی آپ نے جہاز سے نیچے قدم رکھا۔ ایک شوخ چشم انگریز لڑکی نے سامنے آکر ایک پارسل پیش کیا جس میں مہاتما جی کے پہننے کیلئے ایک سوٹ تھا۔ گویا طنز یہ تھی کہ بڈھے کو جو ایک ہی چادر میں ملفوف ہے۔ پہننے کے لئے کپڑا بھی میسر نہیں آتا۔ اس دیدہ دلیر لڑکی کو کون بتاتا کہ اور تو اور خود مہاتما جی نے چرخہ کات کات کر کپڑوں کا اس قدر ڈھیر لگا رکھا ہے کہ انگلستان کے بیسیوں خاندانوں کے ستر ڈھانک سکے۔

اس کے بعد کی سنئے کہ مہاتما جی کو سارے انگلستان میں کسی لڑکی نے بھی اِس

قابل نہ سمجھا کہ آپ کے پاؤں ہی چھوئے اور لنکاشائر کے جولاہوں تک نے بڑھکر اتنا نہ پوچھا کہ باباتمہارے مُنہ میں کتنے دانت ہیں اور اگر کوئی نہیں تو آپ ان کی بجائے مصنوعی دانت کیوں نہیں لگوا لیتے؟

چارلی چپلن کی ذات کو تو چھوڑیئے اس کے تاریخی بوٹ تک کی اتنی قدر ہوئی کہ لڑکیوں نے اسے اُٹھا اُٹھا کر چوما اور لنڈن کے سٹیشن پر لوگوں کے جمِ غفیر نے مطالبہ کیا کہ بوٹ کو اونچا اُٹھا کر سب کو اس کی زیارت کرائی جائے۔ لیکن ہمارے گاندھی جی کی بکری کی طرف کسی نے نگاہ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ حالانکہ اس کی کھال سے چارلی چپلن کے دس بوٹ تیار ہو سکتے تھے

بات در اصل یہ ہے کہ مغربی ممالک میں ایکٹروں اور دیگر بڑی شخصیتوں کا کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ وہاں ایکٹر بہت بڑے آدمی سمجھے جاتے ہیں اور اس کا باعث یہ ہے کہ وہ اپنے فن کو کمال تک پہنچا دینے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھتے۔ ہم نے ایک رُوسی پلاٹ کے فلم میں گریٹا گاربو کو دیکھا کہ وہ سُوکھ کر کانٹا ہو رہی ہے اور اسکی پسلیاں گنی جا سکتی ہیں۔ ہم حیران ہو گئے کیونکہ ہم نے اسے ایک اور فلم میں دیکھا تھا تو اس کا جسم اتنا کمزور نہ تھا۔ ہمیں ہمارے دوست مسٹر سعادت حسن منٹو نے جو ماہر رُوسیات ہیں، بتایا کہ جس عہد کی یہ فلم ہے۔ اس زمانے میں روس کے اندر معیار حُسن عورت کی لاغری تھی۔ اسلئے گریٹا گاربو نے کئی مہینے تک چکوترے کا رس اور دیگر ادویہ استعمال کر کے اپنے جسم کو لاغر بنا لیا تاکہ تمثال حقیقت نظر آئے۔

آپ کہیں گے کہ ہمارے مُلک میں بھی تو بڑی بڑی سینما کمپنیاں ہیں اور بڑے بڑے ایکٹر ہیں، ان ایکٹروں کو کیوں یورپ اور امریکہ کے ایکٹروں کی سی عزت نصیب نہیں۔ اسکے جواب میں ہم سفارش کریں گے کہ آپ "لیلیٰ مجنوں" فلم دیکھیں جس میں ماسٹر نثار نے مجنوں کا پارٹ کیا ہے۔ مجنوں کے متعلق تو آپ جانتے ہوں گے کہ دنیا کا نحیف ترین انسان تھا

لیکن آپ مذکورہ بالا فلم کا مجنوں دیکھیں گے تو آپ سمجھیں گے کہ یہ شخص گاماں پہلوان کے اکھاڑے کا کوئی تیار "پٹھا" ہے اور پھر لطف یہ ہے کہ مجنوں انگریزی وضع کا لباسِ شب خوابی یعنی سلیپنگ سوٹ پہنے ہوئے لیلیٰ کی تلاش میں نکلتا ہے ہمیں صحیح یاد نہیں لیکن قیاس کہتا ہے کہ اس کی کلائی پر رسٹ واچ بھی بندھی ہے۔ اس صورت میں آپ ہی بتائیے کہ کہاں چارلی چپلن اور کہاں ماسٹر نثار۔ اگر چارلی چپلن کی طرح ماسٹر نثار کو گاندھی جی کی ملاقات کا فخر حاصل نہ ہو سکے اور مہاتما گاندھی سے ماسٹر نثار تک ہزاروں میل کا فاصلہ ہو تو اس میں حاجی لق لق کا کیا قصور؟

# شاعر

شاعر دُنیا کا عجیب و غریب انسان، اگرچہ زمین پہ بستا ہے۔ لیکن پرانی داستانوں کی کشتی کی طرح آسمان کی خبر لاتا ہے۔ مطالعۂ فطرت اس کا عزیز ترین مشغلہ ہے۔ اسے ہر ذرہ میں خورشید نظر آتا ہے اور ہر گلزارِ جہاں، بہارِ جان کے حُسن میں جلوۂ حقیقت۔

یہ زندانِ محبت کا ظفر علیخاں، اور صنم خانۂ عشق کا پنڈت مدن موہن مالویہ اپنی دُھن کا پکا ہے۔ مشرقی صاحب کے "رعایتی اعلان" کے باوجود کعبے نہیں جاتا اور بُت خانے ہی کو "قبلۂ حاجات" بنائے رہتا ہے۔ واعظ و شیخ سے اسے بڑی عداوت ہے میکدے میں بیٹھ کر وہ نہیں دعوتِ میخواری دیتا رہتا ہے۔ محتسب سے ذرا دبتا ہے۔ لیکن صرف اس وقت تک جب تک کہ طبیعت "راست" نہ ہو جائے۔ بڑا دردمند ہے۔ رونے پہ آتا ہے تو طوفانِ نوح کی یاد تازہ کر دیتا ہے۔ آہوں سے آسمان کو چھلنی کرنا اس کے لئے معمولی بات ہے۔ اسکی فریاد کائنات کو ہلا دیتی ہے۔ اس کا شیون آسمانی فرشتوں کے علاوہ زمینی فرشتوں یعنی پولیس کے کانسٹیبلوں تک کو

مضطرب کر دیتا ہے۔ لیکن محبوب پر اس کے گریہ و بکا کا خاک اثر نہیں ہوتا۔ رقیب بھی اس کی جلالی قوتوں کی زد سے بالاتر ہے۔

رونے میں شاعروں کے بڑے بڑے مقابلے ہوتے ہیں مثلاً ایک دفعہ ایک شاعر نے اپنے مدِمقابل کو چیلنج دیتے ہوئے کہا ؎

رونے پہ باندھے جو مری چشمِ تر کمر　　کیا ہے زمین فلک پہ ہو پانی کمر کمر

دوسرے شاعر نے کہا "واہ صاحب! یہ بھی کوئی رونا ہے؟ اگر پانی کمر کمر ہو گیا تو کیا قیامت آگئی۔ بلدیہ والے اسے پمپ انجنوں کے ذریعے کھینچ کر دریاؤں میں ڈال دیں گے سُنئیے رونا اس کا نام ہے ؎

میں وہ رونے والا جہاں سے چلا ہوں　　جسے ابر ہر سال رونا رہے گا

معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کے کم از کم دو دل ہوتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ کئی سو جن کے صرف دو دل ہوتے ہیں ان میں سے ایک کے اندر تصویرِ یار ہوتی ہے۔ جسے وہ گردن جھکا کر دیکھ لیا کرتا ہے۔ یا جس میں میٹھا میٹھا سا درد رہتا ہے یا جس پر نگاہِ یار تیر برساتی ہے۔ اور دوسرا دل وُہ ہوتا ہے جو محبوب چھین کر لے جاتا ہے اور جس کے واپس لینے کے لئے شاعر اپنے محبوب کے پیچھے پیچھے اس طرح بھاگتا پھرتا ہے جس طرح تانگے کے پیچھے گداگر یہ کہتا ہوا دوڑتا ہے کہ "دے جا۔ دے جا۔ دے جا"

جن شاعروں کے پاس سینکڑوں دل ہیں۔ وہ دلوں کی پوٹلی ہر وقت اپنی جیب میں رکھتے ہیں اور جونہی کوئی اچھی صورت دیکھی، ایک دل نکال کر پھینک دیتے ہیں۔ یورپ میں مصنوعی دلوں کی ایجاد نے انہیں اور بھی دلبر بنا دیا ہے کیونکہ اب اصلی دلوں کا ذخیرہ ختم ہونے پر وہ مصنوعی دل خرید لیا کریں گے۔

دُنیا کا ایمان اس بات پر ہے کہ اللہ تعالیٰ مارے گا۔ مار کر جگائے گا اور پھر نہ مارے گا ــــــ لیکن شاعر ہر روز مرتا ہے اور جھٹ زندہ ہو جاتا ہے ساگر وہ کچھ عرصہ تک مرا بھی رہے تو اس کی موت نرالی ہوتی ہے کیونکہ وہ مردہ حالت میں بھی بات چیت کر سکتا ہے۔ قبر کے اندر پڑا پڑا التجائیں کرتا ہے کہ "اے میرے محبوب! میری قبر پر تو آ۔ اور ایک ٹھوکر سے مجھے زندہ کر دے ـــــ" معشوق کو ہر روز کے مرنے والے عاشق سے بڑی ضد ہوتی ہے۔ وہ اگر قبر پر آ بھی جائے تو جوشِ غضب میں آ کر قبر کو ٹھوکروں سے پامال کر دیتا ہے۔ لیکن اس کا اثر اُلٹا ہوتا ہے۔ یعنی پہلی ٹھوکر رسید ہوتے ہی شاعر آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوتا ہے اور معشوق کے لئے پھر زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔

شاعر کی ابتدائی زندگی بڑی دلچسپ ہوتی ہے۔ وہ جب شاعری کے میدان میں قدم رکھتا ہے تو پہلی مشکل پیش آتی ہے کہ تخلص کیا رکھا جائے جو تخلص اسے اچھا معلوم ہوتا ہے۔ وہ پہلے ہی بیسیوں شاعروں کا تخلص ہوتا ہے۔ کم بختوں نے کوئی عمدہ لفظ بھی تو نہیں چھوڑا جو تخلص کے کام آ سکے۔ شاعر گھبرا کر کتابوں کی ورق گردانی کرتا ہے کہ تخلص کیلئے کوئی دلکش لفظ مل سکے۔ لیکن ناکام رہتا ہے اور بالآخر اختر، قمر، وفا وغیرہ کی قسم کا کوئی تخلص رکھ کر کام شروع کر دیتا ہے۔

لیکن ہمارے خیال میں اس ناکامی کا باعث شاعر کی قدامت پسندی ہے۔ ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ اگر جگر، آہ اور دل تخلص ہو سکتے ہیں۔ تو کلیجہ، پھیپھڑا، گُردہ، انتڑیاں وغیرہ کیوں نہیں ہو سکتے؟

تخلص کے مرحلہ کے بعد شاعر کو یہ فکر لاحق ہوتی ہے کہ وہ "امرت دھارا" کی سی شہرت حاصل کرنے کے لئے کس قسم کے اشعار لکھے۔ وہ دیکھتا ہے کہ گل و بلبل والی

شاعری اب چنداں مقبول نہیں۔ البتہ مزاحیہ اشعار بہت پسند کئے جاتے ہیں۔ وہ حاجی لق لق کی پولیٹیکل غزل چھپی ہوئی دیکھتا ہے تو ارادہ کر لیتا ہے کہ مزاحیہ اشعار لکھنے کی مشق کروں گا۔ چند روز کے بعد اسے خیال آتا ہے کہ مزاحیہ شاعری کچھ سنجیدہ چیز نہیں اصل شاعری قومی شاعری ہے۔ چنانچہ اس خیال سے وہ اپنی شاعری کا پروگرام بدل کر سیاسی نظموں کی مشق شروع کر دیتا ہے۔ لیکن ایک روز اس کی نظر "نیرنگِ خیال" کی فہرستِ خطابات پر پڑتی ہے اور وہ سوچتا ہے کہ روزانہ اخباروں اور اُن کے مندرجات کی عمر ہی کیا ہوتی ہے۔ صرف ایک دن؛ شعر کی صحیح قدر تو رسالوں میں ہوتی ہے جہاں خطاب بھی ملتے ہیں۔

یہ خیال آتے ہی شاعر سیاسی نظموں کو خیرباد کہہ دیتا ہے اور رسالوں کے لئے نظمیں لکھنے لگتا ہے۔ تھوڑی سی مشق کے بعد وہ اپنی بہترین نظم کسی رسالہ کو بھیجدیتا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے وہ شائع نہیں ہوتی۔ اس پر شاعر اپنی شہرت کے لئے کوئی نیا میدان ڈھونڈھتا ہے۔ وہ بازاروں میں مشاعرہ کے پوسٹر دیکھتا ہے۔ جن میں شعراء حضرات کے ناموں کے ساتھ "مولانا"، "حضرت" اور "علّامہ" وغیرہ الفاظ لکھے ہوتے ہیں۔ شاعر ارادہ کر لیتا ہے کہ اب شاعروں میں نام پیدا کر دوں گا۔ چنانچہ طرحی غزل لکھکر کسی مشاعرہ میں شریک ہوتا ہے۔ لیکن مشاعرہ کی کارروائی دیکھکر اس کے چہرے پر مایوسی چھا جاتی ہے۔ کیونکہ مشاعرہ میں صرف گوّیا شاعر مقبول ہو سکتے ہیں اور ان کی آواز پر "واہ، واہ"، "سُبحان اللہ" اور "مکرر فرمائیے" کا غل مچ جاتا ہے۔ یہ بیچارہ نہ خوش الحان ہے، نہ موسیقی دان، غرض ان باتوں سے دل برداشتہ ہو کر دل سے وعدہ کرتا ہے کہ اس مشغلہ کو ہی چھوڑ دے۔ چنانچہ کچھ عرصہ کے لئے شعرگوئی ترک

کر دیتا ہے۔ لیکن یہ مرض ایسا نہیں جس سے شفا ہو سکے۔ اس لئے بے چارہ چند روز کے بعد پھر شعر کہنا شروع کر دیتا ہے۔

بہر حال آج کل کے نوزائیدہ شاعروں نے شاعری کی ایک ایسی صنف نکالی ہے جس میں شاعری کے کسی شوقین کی حوصلہ شکنی نہیں ہو سکتی۔ یہ "طرزِ جدید" کی شاعری ہے جس کے لئے نہ علمِ عروض کی واقفیت ضروری ہے اور نہ فصاحت و بلاغت در کار صرف چالیس پچاس خوبصورت الفاظ از بر کرنے پڑتے ہیں جنہیں مختلف اوزان اور مختلف قوافی کے مصرعوں میں سجا کر ایک "شگفتہ" نظم تیار کر لی جاتی ہے اور جو ایسے رسالوں میں چھپ جاتی ہے جن کے ایڈیٹر "نوجوان شاعروں" اور "نئی شاعری" کی سرپرستی کرنا چاہتے ہیں۔

# ایڈیٹر

بڑی شان کا انسان ہے۔ گھر سے نکل کر دفتر کو جاتا ہے تو دُنیا پر اس طرح نظر ڈالتا ہے جس طرح مسولینی حبشہ پر۔

مسولینی کو اپنی اٹلی کی فکر ہے ہٹلر جرمنی کی خیر مناتا ہے۔ اتاترک ترکیہ کی ترقی چاہتا ہے۔ ابن سعود حجاز کی ترفیع میں منہمک ہے۔ لیکن ایڈیٹر کے جگر میں تمام دُنیا کا درد ہے ایڈیٹر تمام دُنیا کا ڈکٹیٹر ہے۔

اپنے دفتر کے کمرے میں بیٹھ کر دُنیا بھر کی قسمتوں کے فیصلے کرتا ہے۔ تمام عالم کی سیاسیات میں ٹانگ اُڑاتا ہے مسولینی نے حبشہ پر چڑھائی کی تو ایڈیٹر کا قلم حرکت میں آیا۔ اور اس نے غضب میں آکر دھمکی دی بس یہیں رُک جاؤ۔ اگر آگے بڑھے تو یاد رکھو کہ ملے لیڈنگ آرٹیکلوں کے کچومر نکال دوں گا۔ چرچل نے ہندوستان کے متعلق کچھ کہا۔ تو ارشاد ہوا کہ بیٹا وہیں بیٹھے اکڑتے ہو۔ ذرا آؤ تو ہندوستان میں وائسرائے بنکر جو ایک ہی نظم میں

حلیہ نہ بگاڑ دوں

ایڈیٹر فطرتاً بہت نیک طینت ہوتا ہے۔ اس کے دل میں وطن پرستی کا جذبہ موجزن ہوتا ہے۔ لیکن کیا کرے غریب کہ دُنیا اسے اپنے اصول پر قائم رہنے نہیں دیتی، مسلمان ہے تو ہندوؤں کی تعریف و حمایت اس لئے نہیں کر سکتا کہ مبادا مسلمان اسے کانگرسی سمجھنے لگیں اور اس کے اخبار کا بائیکاٹ شروع ہو جائے ——— ہندو ہے تو اپنے ہم مذہب بھائیوں کے خوف سے مسلمانوں کو شر پسند لکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور مسلمانوں کے جلوس کے متعلق یہ الفاظ غیر ارادی طور پر اس کے قلم سے نکل جاتے ہیں "جلوس خطرناک اسلحہ سے مسلح تھا۔ اہلِ جلوس بڑے اشتعال کی حالت میں تھے اور ان کے دلوں کے اندر اچھے ارادے نہ تھے"

برادری کا ڈر بیچارے ایڈیٹر کو دلوں کے حالات جاننے کے مدّعی بھی بنا دیتا ہے حتیٰ کہ مسجد شہید گنج کو مسجد کہنا اس کے لئے پاپ بن جاتا ہے۔

دُنیا کے دھندے ایڈیٹر کو بڑے بڑے گناہوں کے ارتکاب پر مجبور کر دیتے ہیں ——— مثلاً اگر وُہ ضمیر بیچکر زمین اور مکان خریدنا چاہتا ہے تو "بلیک میلنگ" کرتا ہے۔ یعنی ناجائز ذرائع سے روپیہ وصول کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ بلیک میلر ایڈیٹر بڑا خطرناک آدمی ہوتا ہے وہ کسی بڑے سیٹھ کے گھر کے متعلق تھوڑے سے حالات معلوم کر لیتا ہے اور پھر اپنے اخبار میں چار کالمی سُرخی کے ساتھ ایک خبر شائع کرتا ہے جس میں ظاہر کرتا ہے کہ ایک مقامی سیٹھ کی لڑکی کا ناجائز تعلق ایک ٹانگے والے سے ہے اور ہم اس کے متعلق مفصل حالات کسی آیندہ اشاعت میں درج کریں گے اس کے ساتھ ہی وُہ سیٹھ جی کے گھر کے متعلق ایسے اشارات لکھتا ہے۔ جس سے سیٹھ جی کو یقین ہو جائے کہ یہ انہی کے گھر کی بات ہے۔ پھر یہ ایڈیٹر ایک پرچہ سیٹھ جی کے نام بھجوا دیتا ہے سیٹھ جی اسے پڑھکر مخصوص اشارات کی بنا پر سمجھ لیتے ہیں کہ یہ انہی کی

دخترِ بلند اختر کے متعلق ہے۔ چنانچہ اگلے روز سیٹھ صاحب ایڈیٹر صاحب سے ملتے ہیں۔ پہلے تو دھمکی دیتے ہیں کہ قید کروا دیں گے۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ ایڈیٹر نہیں دبتا۔ ان کے بٹوے کا مُنہ کھل جاتا ہے۔

بلیک میلنگ کرنیوالا ایڈیٹر راجوں، مہاراجوں اور نوابوں تک سے نہیں چوکتا بلکہ ایسے ایڈیٹر تو اکثر والیانِ ریاست کو ہی اپنا ہدف بناتے ہیں۔

بلیک میلر ایڈیٹر بعض اوقات خوشامد اور قصیدہ خوانی سے بھی پیسہ کماتا ہے۔ چنانچہ کسی رئیس کی تصویر چھاپ کر اس کے متعلق لکھتا ہے :۔

"دُنیا میں ایسا مخیّر اور نیک انسان آج تک نہ ہوا ہے نہ ہوگا۔ حضور والا شجاعت، سخاوت، عظمت، بسالت، طاقت، شوکت اور طہارت میں یکتائے روزگار ہیں ـــــ ملک کے کئی سکول، ہسپتال، یتیم خانے، پاگل خانے آپ کے دستِ سخاوت کے مرہونِ منت ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ وہ ہمیشہ جیتے ہی جائیں اور مرنے کے بغیر پالکی میں بیٹھ کر میدانِ قیامت تک پہنچ جائیں اور وہاں سے سیدھے جنت کو بُک کر دیئے جائیں۔"

ایڈیٹر اپنے اخبار کا ایک پرچہ لیکر جس میں یہ مضمون اور رئیس صاحب کی تصویر چھپی ہو رئیس صاحب کی خدمت میں حاضر ہو جاتا ہے ـــــ "حضور کا اقبال قائم! تحفہ لایا ہوں۔"

رئیس صاحب ملازم کو بُلا کر حکم دیتے ہیں کہ ایڈیٹر صاحب کو پانچ سو روپیہ دے دیا جائے۔

با اصول ایڈیٹر کے لئے اس دُنیا میں مصائب ہی مصائب ہیں۔ وہ قوم کی خدمت کرنا چاہتا ہے۔ حق بات لکھنا چاہتا ہے۔ لیکن اربابِ حکومت کی تیز تیز نگاہیں اُسے ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیتیں۔ اگر ایڈیٹر اپنے اخبار کا مالک بھی ہے تو بعض اوقات ان تیز نگاہوں

سے بے پرواہو جاتا ہے۔ لیکن اگر صرف ایڈیٹر ہے تو مجبور ہے۔ بڑی احتیاط کرتا ہے۔ پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے۔ تاکہ اُس کی "قلم درازی" کے باعث مالکِ اخبار کو نقصان نہ پہنچ جائے اور مالک ناراض ہو کر اس کا "ٹیبن پاٹ" نہ کر دے۔

دفتر میں ایڈیٹر کی بڑی شان ہوتی ہے۔ بڑے سے بڑا آدمی "سائل" بن کر آتا ہے۔ ہر شخص اپنی کامیابی کے لئے ایڈیٹر کا محتاج ہوتا ہے۔ خواہ اس کا تعلق اقتصادیات سے ہو یا سیاسیات سے۔ انجمن سازی سے ہو یا تحریک بازی سے، ہر حالت میں وہ ایڈیٹر کی قلمی اعانت کا آرزو مند ہوتا ہے۔ ہم نے نوابوں اور راجوں تک کو ایڈیٹر کے حضور معروضات پیش کرتے دیکھا ہے ہر سائل کی قسمت کا فیصلہ ایڈیٹر کی ہاں یا نہ پر ہوتا ہے۔

ایڈیٹر کی ڈاک میں بڑے بڑے مقالہ نگاروں کے مضامین اور اچھے اچھے شاعروں کی نظمیں بھی ہوتی ہیں جو اشاعت کے لئے آتی ہیں۔ لیکن ایڈیٹر کا قلم قضا کا قلم ہوتا ہے مضمون کی جو سطر چاہے اُڑا دے۔ نظم کا جو شعر پسند نہ آیا قلمزن کر دیا اور بعض اوقات اگر مناسب سمجھا۔ تو سارے مضمون یا پوری نظم کو پھاڑ کر ردّی کی ٹوکری میں پھینک دیا۔

عام لوگوں کا خیال ہو گا کہ روزانہ اخبار کے ایڈیٹر کو بہت زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔ ہفت روزہ اخبار کے ایڈیٹر کو اس سے کم اور ماہانہ رسالہ کے ایڈیٹر کو بہت تھوڑا —— لیکن معاملہ اس کے برعکس ہے۔ روزانہ اخبار کے ایڈیٹر کے لئے ایڈیٹوریل لکھنے کے بعد صرف یہ کام ہوتا ہے کہ کاتبوں کو ڈانٹنا اور اسسٹنٹ ایڈیٹروں پر برسنا کہ "کیوں جی کل فلاں خبر کو چار کالمی کیوں نہ لکھوایا اور کونسل کی کارروائی کو مختصر کیوں نہ کیا اور فلاں مراسلہ مجھے دکھائے بغیر کیوں شائع کر دیا؟"

ہفت روزہ اخبار کے ایڈیٹر کو عموماً مدیرانِ معاون میسّر نہیں آتے۔ اس لئے اخبار

کو مکمل کرنے کیلئے مختلف اخبارات کے کٹنگ جمع کرنے پر اس کا سارا وقت صرف ہو جاتا ہے ماہانہ رسالہ کے ایڈیٹر کا کام سب سے زیادہ ہوتا ہے ۔ایک آدھ صفحہ کے شذرات لکھنے کے بعد اسے جس مصیبت کا سامنا ہوتا ہے ۔وہ یہ ہے کہ مضمون نگاروں اور شاعروں کے دروازوں پر دستک دیتا پھرے ۔کسی کے دل میں رحم آ گیا تو اُس نے ایک ہفتہ کا وعدہ کر کے چھ ہفتے کے بعد کوئی "نتیجہ فکر" یا "رشحہ قلم" دیدیا ورنہ خیریت! ایڈیٹر بیچارہ صبح سے شام تک اپنی ٹانگیں توڑ کر تھکا ماندہ چارپائی پر لیٹ جاتا ہے اور رات بھر سید سجاد حیدر یلدرم منشی پریم چند اور اختر شیرانی کے افسانوں اور نظموں کے خواب دیکھتا رہتا ہے۔

گھر میں ایڈیٹر کی چنداں وقعت نہیں ہوتی اور ہو بھی کیسے ؟ کہ جب شام کو بچے ارد گرد جمع ہو گئے اور انہوں نے "ابا جی، ابا جی" کا شور مچا کر یہ چاہا کہ ابا جی انہیں گود میں لیکر پیار کریں تو ابا جی گھر میں موجود ہی نہیں ۔ان کی چشم تصور حبشہ میں پہنچی ہوئی ہے ۔جہاں بے شمار بچے اپنی ماؤں کے ساتھ میدان جنگ میں جمع ہو رہے ہیں ۔اباجی کی آنکھیں ان بچوں کے پنجر دیکھ رہی ہیں جو کوئٹہ کی کھدائی میں کئی مہینوں کے بعد برآمد ہوئے ـــــ ایڈیٹر کے بچے اسے اپنا اباجی خیال کرتے ہیں لیکن وہ کیا جانیں کہ ان کا اباجی تمام دُنیا کا اباجی ہے۔

اور بیوی نے جو باہستگی پوچھا کہ "کیوں جی ذرا سر دبا دوں ۔آپ بہت تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہیں" تو کوئی جواب نہیں ۔کیونکہ ایڈیٹر صاحب تو اس خیال میں محو ہیں کہ کل ایڈیٹوریل کس موضوع پر لکھا جائے گا۔

شہر کے کوچہ و بازار میں ایڈیٹر کی بہت عزت ہوتی ہے ۔جس طرف سے گزر جائے ۔انگلیاں اُٹھتی ہیں اور لوگ ایک دوسرے سے کہتے ہیں ۔وہ جا رہا ہے "لافستان" کا ایڈیٹر لیکن غریب کی اصل حیثیت (اور خصوصاً کسی مسلمان اخبار کے ایڈیٹر کی حیثیت) اس وقت

معلوم ہوتی ہے۔ جبکہ وُہ کسی محلہ میں مکان کرایہ پر لینا چاہے ——— مالک مکان یہ سُن کر
کہ وہ ایڈیٹر ہے۔ کہہ دیتا ہے کہ جناب مکان رُک چکا ہے ۔

# حاجی لق لق اور اسمبلی

گھر والوں کی تحریک، محلّہ والوں کی تائید اور دوستوں کی تکرار سے مجبور ہو کر بالآخر ہم بھی پنجاب لیجسلیٹو اسمبلی کی اُمیدواری کیلئے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑے ہو ہی گئے۔

بھئی آخر کوئی کب تک بیٹھا رہے؟ پنجابی لوگوں کا قول ہے کہ بیٹھے بیٹھے "کھوہ" (کنوئیں) خالی ہو جاتے ہیں۔ یعنی اگر آپ کے قبضہ میں مال و دولت سے بھرے ہوئے کنوئیں ہوں اور آپ بیکار بیٹھ کر اِس دولت کو خرچ کرنا شروع کر دیں تو یہ کنوئیں خالی ہو جائیں گے اور ہمارے ہاں تو کنوئیں چھوڑ "حوض" بھی نہیں جسمیں دولت بھری ہو، ان حالات میں اگر ہم اسمبلی کیلئے نہ اُٹھتے تو کیا کرتے۔

بات سے بات نکلتی ہے۔ آپ کہیں گے کہ یہ "حوض" کیا بلا ہے؟ اگر آپ لاہور کے اردگرد کی نوآبادیات کے باشندے ہیں تو آپ کو معلوم ہو گا۔ لیکن اگر "باہر والے" ہیں تو آپ کی اطلاع کے لئے تشریح کی جاتی ہے کہ لاہور کے نواح میں جو نئے محلے آباد کئے

کئے گئے ہیں۔ اُن کے گھروں کا غلیظ پانی جمع کرنے کے لئے ہر گھر کے باہر چھوٹا سا حوض بنایا جاتا ہے۔ جسے بلدیہ کی اصطلاح میں حوضی کہتے ہیں۔ بلدیہ والوں کا فرض ہے کہ حوضیوں کو ہر روز خالی کرائیں لیکن خدا نے ان حوضیوں کو اتنی برکت دے رکھی ہے کہ وہ کبھی خالی نہیں ہوتیں اسی لئے ہمارا خیال ہے کہ اگر کنوئیں کی بجائے ہمارے گھر میں دولت کی ایک حوضی ہوتی اور اس پر بلدیہ کا انتظام ہوتا تو وہ قیامت تک خالی نہ ہو سکتی، اور ہم اسمبلی کی کبھی پروا نہ کرتے، لیکن کیا کیا جائے ؎ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

بہرحال پیٹ کے لئے کہئے یا قوم کی بہتری کے لئے، ہم کسی نہ کسی طرح اسمبلی کے اُمیدوار کی حیثیت سے کھڑے ہو چکے ہیں اور اسمبلی کی کرسی کے سوا کسی دوسری چیز پر نہیں بیٹھ سکتے پیٹ کی ہمیں حاشا وکلّا کوئی فکر نہیں۔ کیونکہ جب ہم خادمِ قوم ٹھیرے تو قوم یقیناً ہمارے پیٹ کی خادم ہے۔ قوم ہمارے پیٹ کی فکر لازمی طور پر کرے گی اور ہم قوم کی خدمت لازمی اور اختیاری دونوں طریقوں سے کریں گے۔ اگر اس دُنیا میں اور اس اسمبلی میں نہ ہو سکی تو اگلے جہان جا کر سہی یعنی بفرضِ محال وہ دُنیا کی توفیق نہ ہو سکی تو ستر آخرت کا ضامن خود خدا ہے۔ قوم اعتبار نہ کرے تو اس کی مرضی، اور اگر اعتبار کر لے تو ہماری دعا ہے کہ اس کے صرف بہتر فرقے رہ جائیں اور باقی سرخپوش، نیلی پوش، سیاہ پوش اور سرکاری سفید پوش فرقوں سے اسے نجات حاصل ہو۔

اسمبلی کے لئے ہمارے کھڑے ہونے کی ایک وجہ اور بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ کھڑے ہونے کی وبا عام ہو گئی ہے۔ اس لئے ہم نے بھی مرگ انبوہ کے جشن میں حصّہ لینا چاہا ہم نے دیکھا کہ بعض ایسے آدمی جنہیں مدتوں سے بیٹھے بیٹھے دیمک لگ چکی تھی۔ اسمبلی کے لئے کھڑے ہو گئے ہیں اور تو اور ہمارے چند اخبار نویس بھائی، جو ملکوں اور قوموں تک کے فیصلے

بیٹھے ہی بیٹھے کرنے کے عادی ہیں اور جنہیں کھڑے ہونے سے کبھی واسطہ نہیں پڑتا اس قومی خدمت کیلئے کھڑے ہوگئے ہیں — ہم نے سوچا کہ اب بیٹھے رہنا اور خوابِ غفلت میں خراٹے بھرنا شرعاً ناجائز ہے۔ اگر بیٹھنا اور سونا ہی مقصود ہے تو یہ کام اسمبلی کی کرسی پر کیوں نہ کئے جائیں؟

انتخاباتِ اسمبلی کی ایک طاقت کے تو ہم بے حد معترف ہیں کہ وہ قوم میں زندگی کے آثار پیدا کرنے میں بے نظیر ہیں۔ یہ اسمبلی ہی کی برکت ہے کہ نہ صرف ہم اور دوسرے امیدوار کھڑے ہوگئے بلکہ کئی اور چیزیں بھی کھڑی ہوگئیں مثلاً ہر طرف فسادات کھڑے ہوگئے۔ جابجا ڈنڈا پولیس کھڑی ہوگئی وغیرہ۔

ہمارے کھڑے ہونے پر کئی انتخابی انجمنوں کے وفود نے ہم سے ملاقات کی اور کہا ہم قوم کے خادم ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ اسمبلی میں آپ سے بہتر نمائندہ بھیجا جانا ناممکن ہے۔ اسلئے حکم ہو تو آپ کا پروپیگنڈہ شروع کیا جائے۔ ہم نے کہا آپ کی عنایت ہے۔ اگر آپ چاہیں تو پروپیگنڈہ شروع کر دیجئے۔ اس پر اہلِ وفد نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ کچھ اشارے کئے اور ایک صاحب بولے "مگر جناب آپ جانتے ہیں کہ ہم لوگ جو اپنا کاروبار چھوڑ کر آپ کی خدمت کریں گے۔ تو آخر ہمارا بھی کچھ حق ہے۔"

ہم مطلب سمجھ گئے اور ہم نے کہا کہ سوچ کر بتائیں گے۔ پھر کبھی تشریف لائیے"۔

ان انجمنوں میں سے ایک کا نام "آل پنجاب انجمن دلالانِ انتخابات" ہے اور ہمیں اس انجمن کی کسرِ نفسی پر حیرت ہوئی کہ اس نے اپنا نام انجمنِ دلالانِ انتخاباتِ ہند کیوں نہیں رکھا! کیونکہ لاہور کی انجمنوں میں سے اکثر آل انڈیا انجمنیں ہیں۔ مثلاً انجمن ہمدردانِ اسلامِ ہند کوچہ تیلی بھناں لاہور، انجمن محافظ اردو ہند پیپل وبہڑہ لاہور، انجمن تنویرِ اخلاقِ ہند بھاٹی دروازہ

لاہور وغیرہ۔

انجمن ولاالآن کے وفد کو ہم نے شرف باریابی بخشا تو اہلِ وفد نے چھوٹتے ہی ایک مقامی اخبار کا کٹنگ ہمارے سامنے رکھدیا۔ اس میں لکھا تھا کہ یہ انجمن محض خدمتِ قوم کے لئے بنائی گئی ہے اور قومی مقاصد لیکر میدان میں اُتری ہے۔ اس کی غرض یہ ہے کہ اسمبلی میں صحیح نمائندے بھیجنے کیلئے قوم میں تنظیم اور پروپیگنڈے کا کام کرے۔ چنانچہ اس مقصد کے پیشِ نظر انجمن کے وفد پنجاب کے مختلف حصص کی طرف رُخ کرنے والے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ الخ

ہمارے اطمینان کے لئے یہ کٹنگ کافی تھا اور ہم نے انجمن کی خدمات حاصل کرنے کا وعدہ کر لیا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہو گیا کہ ہم کس حلقے کی طرف سے امیدوار ہوں گے۔ ہم نے کہا کہ بھئی پنجاب کے تمام شہری اور دیہاتی حلقے تو یار لوگوں نے روک لئے ہیں۔ اس لئے کوئی ایسا حلقہ تجویز کیجئے جو خالی ہو۔ اس پر ایک بافوق نوجوان بول اُٹھے۔ "حضرت حلقۂ زُلف بہتر رہے گا۔" دوسرے صاحب نے "حلقۂ زنداں" تجویز کیا۔ تیسرے بزرگوار نے جو غالباً صوفی فیشن تھے "حلقۂ ذکر" کا نام پیش کیا۔ یہ بحث جاری تھی کہ امیرالبحر سندباد جہازی تشریف لے آئے۔ ان سے دریافت کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ اگر آپ "حلقۂ صد کام نہنگ" کی طرف سے امیدوار ہوں تو تمام آبدار آپ کے حق میں ووٹ دیں گے۔ ہم نے اس تجویز پر صاد کیا اور اس کے بعد سوال اُٹھا کہ کس کے ٹکٹ پر کھڑا ہونا مفید ہوگا؟ شہید گنج ٹکٹ کا ذکر آیا تو ہم نے کہا کہ بھئی مسجد شہید گنج تو لنڈا بازار میں واقع ہے اور اسمبلی اس سے دُور ہے۔ اس لئے اگر ہم شہید گنج کا ٹکٹ لیکر اسمبلی میں جا پہنچے تو ممکن ہے کہ فالتو سفر کا کرایہ و چند چارج کر لیا جائے۔ کانگریس کا نصب العین مکمل آزادی ہے اور ہمیں ڈر ہے کہ اگر ہم کانگریس کے ٹکٹ پر کامیاب ہو گئے اور ہمارے اسمبلی میں جانے سے کانگریس کو، یا خود ہمیں مکمل آزادی مل گئی تو خدا جانے ہم کیا

کیا نہ کر گزریں گے۔ لہٰذا کانگرس اور ان کی مکمل آزادی سے دور ہی رہنا بہتر ہے۔ اسی طرح اور کئی ٹکٹوں کا ذکر چھڑا لیکن ہم نے سب کو مسترد کر دیا اور جب اہلِ وفد نے کہا کہ حضرت آخر آپ بھی تو بتایئے کہ آپ کس ٹکٹ پر جانا چاہتے ہیں تو ہم نے دھیمی آواز سے کہا کہ بھائیو! ایک راز کی بات بتاتا ہوں بشرطیکہ آپ اُسے سر ظفر اللہ خاں ریلوے ممبر تک نہ پہنچا دیں۔ بات یہ ہے کہ حاجی بننے سے پہلے ہم ہمیشہ ریلوے کا سفر ٹکٹ کے بغیر کرتے رہے اور بے ٹکٹ جانے کی کچھ ایسی عادت ہو گئی ہے کہ اب اسمبلی میں بھی ٹکٹ پر جانے کو دل نہیں چاہتا۔ اس لئے ہمارا فیصلہ یہ ہے کہ ہم اسمبلی میں بے ٹکٹ ہی جائیں گے۔ اگر آپ اسے اعانتِ مجرمانہ نہ سمجھیں تو بے ٹکٹ اسمبلی تک پہنچنے میں ہماری مدد کریں۔

ارکانِ وفد بولے کہ صاحب مجرمانہ اور غیر مجرمانہ کا ہمارے ہاں کوئی سوال ہی نہیں ہم اپنے امیدوار کی کامیابی کے لئے ہر قسم کا جرم کرنے کیلئے تیار ہیں۔

اس مباحثہ کے بعد اور انجمن کے "حق حقوق" طے ہو جانے پر یہ مجلسِ مشاورت برخاست ہوئی اور ہم نے انجمن کو اختیار دے دیا کہ وہ ہمارے پروپیگنڈہ کا کام شروع کر دے اور باذوق اصحاب سے درخواست ہے کہ وہ اپنے قیمتی ووٹ حاجی لق لق کو دیں۔ "حاجی لق لق کو یاد رکھنا" — "آپ کے ووٹ کے صحیح حقدار حاجی لق لق ہیں"۔

---

# حاجی لق لق کا باپ

باوا آدم، اماں حوّا اور حضرت عیسٰی کے سوا باقی تمام دُنیا کا باپ ہے نہ تھا یا ہوگا۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ تمام دُنیا خدا نے بنائی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ باپوں کی مہربانی بھی ہے۔ باپ نہ ہوتے تو کوئی نہ ہوتا۔ باپ ہر شخص کا ہوتا ہے۔ امیر، غریب، شاہ، گدا سب اپنے اپنے باپ کے بیٹے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بعض لوگوں کے باپ ملک نور الٰہی مالک اخبار "احسان" کی طرح زندہ ہیں اور بعض کے باپ حاجی لق لق کے باپ کی طرح مر چکے ہیں ـــــ اور وہ اس طرح نظر آتے ہیں جیسے ان کا باپ مر گیا ہو۔

باپ کا زندہ ہونا بیٹے کیلئے بڑی برکتوں کا موجب ہوتا ہے لیکن یہ کوئی کلیہ نہیں کیونکہ بعض باپ اپنے بیٹے کیلئے مصیبت کا باعث ہوتے ہیں اور بعض باپ تو بہت خطرناک ہوتے ہیں چنانچہ حضرت عواص باوباقی نے اپنی مشہور نظم میں ایک باپ اور بیٹے کی دلچسپ داستان لکھی ہے۔ یہ نظم اس شعر سے شروع ہوتی ہے ؎

ایک لڑکے نے بڈھے باپ سے اپنے کہا ــــ اب لڑکپن چھوڑ دے بابا بہار آنے کو ہے

باپ کی قدر حاجی لق لق سے پوچھیے جس کا باپ انتقال کر گیا ہے۔ ہمارے والد بزرگوار فرشتہ تھے فرشتہ بالکل پرانی وضع کے انسان۔ جنگ عظیم کی ابتدا میں ہم امرتسر کے چونگی خانہ میں کلرک تھے۔ بائیسکل خریدنے کو جی چاہا لیکن تنخواہ صرف پندرہ روپے تھی اور اچھا بائیسکل ستر اسّی روپے سے کم قیمت میں نہ ملتا تھا۔ ہم نے

ایک تجویز سوچی۔ بارہ آنے خرچ کر کے اپنے والد کے نام تار بھیج دیا کہ "ہم فوج میں بھرتی ہو کر فرانس جا رہے ہیں، منہ دیکھنا ہو تو آجاؤ!"

دوپہر تک ہمارے والدِ محترم چھونگی کے صدر دفتر میں پہنچ گئے اور ہمیں دیکھتے ہی زار و قطار رونے لگے، فرمایا کہ تمہاری والدہ نے سر کے بال نوچ لئے ہیں اور رو پیٹ کر اپنی جان ہلکان کر رہی ہے اگر تم ضرور جنگ میں جانا چاہتے ہو تو میرے ساتھ گھر چلو اور اپنی والدہ کو صورت دکھا آؤ۔ ہم نے عرض کیا کہ غلطی ہو گئی ہے۔ خواہ مخواہ فوج میں نام لکھوا لیا۔ دل نہیں چاہتا کہ آپ کو داغِ مفارقت دیا جائے لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا ہے۔

ابا نے فرمایا کہ کوئی ایسی صورت بھی ہو سکتی ہے کہ تم فوج سے اپنا نام کٹا لو؟ عرض کیا کہ صرف ایک صورت ہے۔ بھرتی والے افسر کی خدمت کرنی پڑیگی اور وہ سو روپیہ سے کم پر رضا مند نہ ہوگا۔

ہمارے والد کے چہرے پر اطمینان کی جھلک نمودار ہوئی اور فرمایا "سو روپیہ! چلو میرے ساتھ اور سو روپیہ لا کر اس مصیبت سے نجات حاصل کرو"۔

ہم ان کے ہمراہ شام کی گاڑی سے گئے اور دوسری صبح سو روپیہ لیکر واپس امرتسر پہنچ گئے۔ ان میں سے ساٹھ روپے کی بائیسکل خریدی اور باقی جیب خرچ کے لئے رکھ لئے۔

کچھ عرصہ کے بعد والدِ بزرگوار امرتسر آئے اور انہوں نے دیکھا کہ ہمارے پاس ایک بائیسکل ہے۔ پوچھا کہ یہ کہاں سے لے لی؟ عرض کیا کہ بھرتی کرنیوالے افسر نے انعام میں دی تھی۔

ابا نے ناراض ہونے یا حیران ہونے کی بجائے ایک قہقہہ لگایا اور کہا "بیٹا اس بہانے کی کیا ضرورت تھی؟ صاف کہدیتے کہ بائیسکل چاہیے"۔

ایک دفعہ حفیظ جالندھری ہمارے پاس آئے۔ یہ بہت پرانی بات ہے۔ نواب بہاول پور اور حکومتِ پنجاب نے تو حفیظ صاحب کی آج قدر کی ہے لیکن ہم انکی قدر اس وقت سے کرتے چلے آتے ہیں جبکہ انکی عمر سولہ سترہ برس کی تھی۔ ان ایام میں حفیظ صاحب ریختہ کہا کرتے تھے۔ والدِ بزرگوار نے یہ معلوم کر کے کہ یہ ہمارا دوست شاعر بھی ہے،

حفیظ سے کلام سنانے کی فرمائش کی حفیظ صاحب نے چند شعر عرض کئے اور حضرت نے فرمایا کہ "تم ایک بہت بڑے شاعر بننے والے ہو۔ تمہارے اشعار سے ایک شاندار مستقبل کی خوشبو آتی ہے۔" آج مرحوم کی یہ پیشگوئی پوری ہو چکی ہے۔

والدِ محترم ایک زمانہ میں بمقام ڈیرہ اسماعیل خاں محکمہ بندوبست میں ملازم تھے۔ تین ماہ تک ماتحت ملازمین کو تنخواہ نہ ملی خزانہ میں روپیہ موجود نہ تھا۔ ملازمین نے حضرت سے درخواست کی کہ ایک وفد بندوبست کے افسرِ اعلیٰ سے ملاقات کرے۔ آپ نے فرمایا کہ ٹھیرو میں اپنی طرف سے ایک درخواست بھیجتا ہوں۔ اگر اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو وفد کی تجویز پر عمل کیا جائیگا۔ آپ نے ایک منظوم درخواست لکھی جس کے مندرجہ ذیل دو شعر میں اپنے باوا کی جاگیر سمجھ کر اپنا چکا ہوں ——— یعنی اپنی ایک نظم میں شامل کر چکا ہوں ؎

گھر سے خط آتے ہیں تم نے خرچ کچھ بھیجا نہیں ۔۔۔ کیا وہاں پردیس میں ٹھہرائی اور اک بیاہ کی؟
یہ خبر ان کو نہیں، شادی عروسِ غم سے ہے ۔۔۔ رات فاقے سے گزرتی ہے یہاں نوشاہ کی

بذلہ سنجی مرحوم کی خصوصیت تھی۔ دِلی دربار کے دنوں میں ہم میر سرفراز حسین بی، اے علیگ تحصیلدار بندوبست ضلع لاہور کے سررشتہ دار تھے۔ دلی دربار میں انکی ڈیوٹی لگ گئی اور وُہ ہم سے کہنے لگے کہ میرے ساتھ دلی چلو۔ عرض کیا کہ دِتّی کے نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سُنیگا ہم اپنے شہر کے "دِلّی دربار" میں شرکت کرنا چاہتے ہیں۔ جہاں لوگ ہمارے انتظار میں ہوں گے۔ ہم نے ایک نظم لکھی اور اپنے شہر چلے گئے۔ وہاں مرزا شجاع مبارک بیگ کی کوٹھی پر دِلّی دربار کی تقریب میں ایک عظیم الشان جلسے کا انتظام کیا گیا تھا ہم نے نظم پڑھی۔ جسے بہت پسند کیا گیا۔ جلسے کے اختتام پر ایک بڑے سرکاری افسر نے ہم سے مصافحہ کیا اور ہمارے والد صاحب سے مخاطب ہو کر کہا "صاحبزادہ آپ کی گستاخی کا نتیجہ ہے"۔ . . . . ہم نے افسر سے کہا "خاموش

رہتے جناب !۔۔۔ ہمارے والد نے یہ سُنکر ہمیں ڈانٹا اور افسر سے کہا "جناب میرے بیٹے نے آپ سے گستاخی کی ہے۔ میں اس کیلئے معافی کا خواستگار ہوں۔"

نواب رامپور کے سابق ایڈی کانگ سردار بہادر کرنل مرزا محمد علی بیگ ہمارے والد سے دوستانہ مراسم رکھتے تھے۔ ایک دفعہ ہمارے مکان پر آئے جہاں ہمارا ایک دیہاتی رشتہ دار میلے کچیلے کپڑے پہنے ہاتھ میں لٹھ لئے مرحوم کے پاس بیٹھا تھا۔ کرنل صاحب نے طنزیہ لہجہ میں فرمایا۔

"کیوں حضرت! یہ بھی آپ کا کوئی رشتہ دار ہے؟"

والد مرحوم نے جواب دیا "ہاں مرزا صاحب! میرا اس کا تقریباً وہی رشتہ ہے جو آپ کا اور مرزا ۔۔۔ کا ہے (والد صاحب نے یہاں کرنل صاحب کے ایک ایسے رشتہ دار کا نام لیا جو بکریاں چرایا کرتا تھا)

والد مرحوم کی زندگی کے حالات کہاں تک بیان کروں۔ اس کیلئے ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہے۔ بہرحال مجھے فخر ہے کہ میں اپنے باپ کا بیٹا ہوں اور ایسے باپ کا بیٹا ہوں جس کا بیٹا ہونا ایک قابلِ فخر بات ہے۔

میں اپنے تمام دوستوں کا بے حد ممنونِ احسان ہوں جنہوں نے اخبار "احسان" میں میرے والد کے انتقال کی خبر پڑھکر ٹیلیفون پر، یا بالمشافہ یا خط کے ذریعے مجھ سے اظہارِ ہمدردی کیا ہے۔ لیکن میں اُنہیں بتا دینا کارِ ثواب خیال کرتا ہوں کہ میرے والد بزرگوار سنہ ۱۹۲۴ء میں فوت ہوئے اور میرے دوست کام ریڈ (کامریڈ) محمد اشرف خاں صاحب عطا کی عنایت ہے کہ انہوں نے اپنے قلم سے میرے والد مرحوم کو دوبارہ مار دیا

**جَزَاہُ اللہ فِی اِحْسَانِ خَیْرا**

# لیٹر بکس کا اغوا

جن لوگوں نے ہمارا مضمون "عینک کا اغوا" پڑھا ہے۔ وہ اس مضمون کی سُرخی پڑھکر دل میں ضرور خیال کریں گے کہ حاجی لق لق بھی عجیب آدمی ہے کہ عینک گم ہوئی تو اسے اغوا سے منسوب کر دیا اور لیٹر بکس کھویا گیا تو اس کے متعلق "لیٹر بکس کا اغوا" کے عنوان سے مضمون لکھنے بیٹھ گیا آخر یہ "اغوا" کہاں کا "امرت دھارا" ہے کہ ہر جگہ استعمال کیا جاسکتا ہے:

ہمارے معترضین کا خیال درست ہے کہ اغوا کا لفظ آج سے پہلے صرف عورتوں کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ لیکن جس طرح دُنیا اپنے دیگر شعبوں میں ترقی کر رہی ہے۔ اسی طرح علم و ادب بھی وسیع تر ہوتا جا رہا ہے اور الفاظ کے معانی رسالہ "ادب لطیف" کے حلقہ قارئین کی طرح پھیل رہے ہیں۔

"اغوا" کو زنانہ حلقۂ استعمال سے نکالنے کا فخر صوبہ سرحد کو حاصل ہے اور اس

فخر بخشی کا سہرا صوبہ سرحد کے "سر سید احمد خاں" صاحبزادہ سر عبد القیوم مرحوم کو حاصل ہے جنہوں نے صوبہ میں تعلیم عام کر کے وہاں کے باشندوں کو انسان بنایا اور ادبی چھوت چھات دور کر کے ہندوؤں تک کو اغوا جیسے سو فیصدی اسلامی الفاظ سے شناسا کر دیا۔ آجکل وہاں یہ ہوتا ہے کہ ڈاکو لوگ جب ایک بھلے چنگے مونچھ داڑھی والے سیٹھ کو اٹھا لیجاتے ہیں تو شور مچ جاتا ہے کہ لالہ جی کو پٹھان اغوا کر کے لے گئے۔

آہستہ آہستہ جب مردانہ اغوا کی تحریک دُنیا بھر کے متمدن ممالک میں پھیلی تو ہر واقعہ کے متعلق یہی لفظ استعمال ہونے لگا مثلاً امریکہ میں ہوا باز کے بیٹے کا اغوا۔ رُوس میں ایک سیاسی لیڈر کا اغوا چین میں ایک پادری کا اغوا، اور وسن پورہ لاہور میں ایک لیٹر بکس کا اغوا۔

ہمیں ذرا حیرت ہے تو اس بات پر کہ اغوا کے بے ضرر ہو جانے کے باوجود ہمارے قومی لیڈروں کو یہ لفظ کیوں ناگوار ہے اور ہمارے اخبار پولیس والوں کے نیم شبی چھاپوں کے متعلق کیوں یہ لفظ استعمال نہیں کرتے جن میں یہ لوگ لیڈروں کو چپکے سے موٹر میں بٹھا کر کہیں سے کہیں پہنچا دیتے ہیں؟ ایسے واقعات کے دوسرے دن ہم اخبارات میں یہ سرخیاں کیوں نہیں دیکھتے کہ "مولینا ظفر علی خاں کا اغوا" "ملک لال خاں کا اغوا" "کامریڈ موہن لال کا اغوا"

ہمارے خیال میں اگر اغوا کے متعلق تذکیر و تانیث کا فرق نہ مٹتا تو ہمارے بعض لیڈروں کے متعلق اغوا کا استعمال کرنا بہت موزوں ہوتا۔

بہر حال جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہمارے ہاں سے دونوں قسم کے اغوا ہوتے یعنی مونث بھی اور مذکر بھی۔ پہلے ہماری عینک اغوا کر لی گئی جو خیر سے بی صاحبہ تھیں اور

مسٹر عبداللطیف رائل او پیشینٹس ہسپتال روڈ لاہور کا عطیہ تھیں۔اس کے بعد برخوردار لیٹر بکس اغوا کر لیا گیا جو ہمارا طبع زاد مذکر تھا یعنی ہم نے اسے اپنی طبیعت کیمطابق اپنے ہاتھوں سے اپنا نام لکھکر دروازے کے باہر لٹکایا تھا۔

یہ چند روز کا واقعہ ہے اور اس کا علم اس وقت ہوا جب کہ ہم صبح سویرے دروازے سے باہر نکلے تاکہ لیٹر بکس سے ڈاک نکالیں ہم نے دیکھا کہ ڈاک تو کیا وہاں سرے سے لیٹر بکس ہی غائب ہے۔ ہم واپس اندر چلے گئے اور اپنی اکلوتی کرسی پر بیٹھکر سوچنے لگے کہ الٰہی یہ کیا ماجرا ہے اور یہ کام کس نے کیا ہوگا؟

شاید کل دوپہر کو چھٹی رسان نے کوئی بھاری بھر کم لفافہ لیٹر بکس میں ڈالا ہو اور کسی بے روزگار کو گھبراہٹ نے اسے دیکھکر یہ سمجھ لیا ہو کہ لفافے میں نوٹ ہیں یا چٹھی رسان نے کوئی رنگین ٹائیٹل والا رسالہ بکس میں ڈالا ہو اور اسے کسی "رسالہ چور" نے دیکھ لیا ہو یا یہ کسی اشتراکی ادیب کا سوشلسٹک کارنامہ ہے یعنی یہ کہ اس نے میرے مکان کو دیکھکر خوب دانت پیسے ہوں کہ "یہ بیں ؟ حاجی لق لق ایسے شاندار مکان میں رہے۔ اور ہم کرائے کی کوٹھڑی میں زندگی بسر کریں؛ لیکن جب اسے مکان گرانے کے لئے کوئی کدال یا بیلچہ نہ ملا ہو۔ تو اس نے لیٹر بکس ہی کھینچ لیا ہو اور اسے بغل میں داب کر یہ کہتا ہوا چل دیا ہو" کہ چلو جاتے چور کی لنگوٹی ہی سہی"۔

غرض ہم نے بہت سے قیاسات دوڑائے۔ لیکن آخر قیاسات، قیاسات ہی تو تھے یقین کے ساتھ کیا کہا جا سکتا تھا کہ ہمارے لیٹر بکس پر کس نے ہاتھ صاف کیا ہے؟ اور پھر یہ کوئی ایسی چوری نہ تھی جسے کسی لالچ پر مبنی قرار دیا جا سکے۔ کیونکہ سنگاردان، عطردان باندان اور گلدستہ دان کی چوری سے تو کچھ حاصل ہو سکتا ہے چھٹی دان کی چوری سے

کیا حاصل ؛

آخر یہ عقدہ دوسرے دن کھلا جب ہم نے اپنے دفتر میں جاکر اپنا ہی اخبار "احسان" پڑھنا شروع کیا اور ہماری نظر ان الفاظ پر پڑی :۔

"حاجی لق لق کا لیٹر بکس مکتبہ اُردو میں پڑا ہے۔ حاجی صاحب آکر لے جائیں"۔

ان الفاظ کے نیچے نویسندہ نے ہمیں اُلٹا کرکے لکھ دیا یعنی اپنا نام" راقم حاجی قل قل" لکھ دیا۔

ہم فوراً سمجھ گئے کہ یہ کون ذاتِ شریف ہیں۔ وہی ہمارے پرانے دوست اشتراکی ادیب باری!

مکتبہ اُردو میں جاکر معلوم ہوا کہ اغوا کرنے والی پارٹی تین شرفا پر مشتمل تھی جن میں دو ادیب تھے اور ایک ادب فروش یعنی میرزا ادیب، اشتراکی ادیب اور چودھری نذیر احمد مالک مکتبہ اُردو۔ ہم نے اس مثلث مساوی الاضلاع کو غور سے دیکھا اور پوچھا کہ حضرت یہ کیا حرکت ہے؟ جواب ملا کہ ہم تینوں آپ کے گھر پر پہنچے تھے۔ باہر تالا لگ رہا تھا اس لئے ہم نے مناسب خیال کیا کہ جاتے وقت جن کی طرح کوئی نشانی دیتے جائیں۔

چند منٹ تک اس واردات اغوا کے متعلق باتیں ہوتی رہیں آخر باری صاحب بولے "حاجی صاحب! معاف کرنا۔ میں نے لیٹر بکس کو کاٹ کر چٹھیاں نکال لی تھیں اور آپ یہ سُن کر خوش ہوں گے کہ ان میں ایک لفافہ ایسا ہے کہ اس میں سے عطر کی خوشبو آرہی ہے اور نیز اس پر پتہ بھی کسی زنانہ ہاتھ کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے"۔

ہم گہری سوچ میں پڑ گئے اور کئی باتیں ہمارے ذہن میں آئیں مثلاً یہ کہ ہم رسائل میں مضمون تو لکھتے ہی ہیں اور آج کل کی تعلیم یافتہ لڑکیاں بعض اوقات مضمون لکھنے والوں سے

راہ و رسم بھی پیدا کر لیتی ہیں اور پھر ہماری تو تصویر بھی "احسان" کے سالنامہ میں چھپ چکی ہے، کیا عجب کہ کسی بدذوق معشوقہ کو ہماری ڈاڑھی اور مونچھیں پسند آ گئی ہوں۔"

ہم نے ذرا بے صبری سے کہا کہ لائیے وہ چٹھی کہاں ہے؟ باری صاحب بولے۔ "واہ ہم ایسی چٹھی کوئی مفت دینے والے ہیں؟ مٹھائی کھلاؤ پہلے"۔ ہم نے بہتیرا کہا۔" کہ بھیا یہ دلالی کی لت کب سے پڑی ہے لیکن ہمارے سامنے تین زبانیں قینچی کی طرح چل رہی تھیں اور بڑی متانت کیساتھ ہمیں یقین دلایا جا رہا تھا کہ واللہ مذاق کی بات نہیں۔ خدا کی قسم لفافہ معطر ہے اور پتہ زنانہ ہاتھوں کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

ہم نے سپر ڈالدی اور ایک روپیہ میز پر رکھ کر کہا "لائیے، اب تو چٹھی حوالے کیجئے۔ لیکن تینوں نے یکزبان ہو کر کہا "مٹھائی کھا چکنے کے بعد"

چنانچہ مٹھائی منگوائی گئی اور جب ہمارا روپیہ ان کے پیٹ میں جا چکا تو باری صاحب نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک چٹھی نکال کر ہمارے ہاتھ میں دیدی۔ پتے کی تحریر فی الحقیقت پختہ نہ تھی اور۔ . . . نعرۂ تکبیر! . . . . لفافے میں سے عطر کی لپٹیں بھی آ رہی تھیں۔

ہماری باچھیں کھل گئیں اور ہم نے اسے بڑی عجلت کیساتھ کھولا اور چٹھی ہاتھ میں لیکر اپنے دوستوں سے چار قدم پیچھے ہٹ گئے تاکہ فرستندہ کا نام پتہ یا چٹھی کا مضمون نہ پڑھ لیں۔

ہم نے چٹھی کو پڑھا اور ہمارے چہرے پر غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی یہ چٹھی تاج الدین احمد الدین تاجرانِ عطر کی طرف سے تھی جس میں لکھا تھا کہ گذشتہ تین ماہ سے آپ کی طرف پانچ روپے بقایا چلے آتے ہیں۔ بھلے مانسوں کی طرح ادا کر دیجئے۔ ورنہ . . . . . ؟"

---

# شملہ کی سیر

جب نواب سَر عُمر حیات خاں ٹوانہ، سَر اے، کے غزنوی اور نواب سَر مہر شاہ جیسے مسلمان شِملے پہنچ چکے تھے تو حاجی لق لق خدا نخواستہ اسلام سے تو خارج نہ تھے۔ کہ فرازِ شملہ کی گلگشت کا لطف اُٹھانے کے لئے ایک عدد مصلّےٰ اور مبلغ ایک عدد لوٹا لیکر نہ پہنچ جاتے، ہماری تند مزاجی کے باعث ہمارے کسولی جانے یا بھیجے جانے پر شاید گھر والوں کو آج تک اعتراض نہ ہو، لیکن شملے جانے کے لئے ہمیں بہانہ وضع کرنا پڑا۔ کہہ دیا کہ اجمیر شریف کے عُرس پر جا رہے ہیں۔ وُہ بیچاری کیا جانیں کہ عرس کس مہینے میں ہوتا ہے۔ البتہ گرم کپڑے اور رضائی سامان کیساتھ باندھنے پر وُہ ضرور معترض ہُوئیں۔ لیکن یہاں جواب گھڑنے کیا دیر لگتی تھی، ہم نے فوراً جیب سے ایک مسلمان اخبار نکالا اور کہا۔ دیکھئے یہاں لکھا ہے:-

"خطۂ اجمیر آج کل تبرید و تثلیج کے روح فرسا امیال و عواطف کے باعث

غیرتِ صدطبقۂ زمہریر بن رہا ہے۔ اس لئے ناظرین اگر اپنی سیزدہ صد سالہ روایاتِ صحیح کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں تو اپنی معیت میں البتہ سرمائی اور فرشِ وافر از قسمِ توشک ولحاف، نمدہ ولطانیہ لازمی طور پر لے جائیں ۔ ورنہ مصائب ونوائب کے ایک طوفانِ مواج سے پالا پڑیگا۔

اطلاع دیروزہ منتشرہ ہے کہ خطِ حدیدی (ریلوے لائن) کو کثرتِ باراں سے بعید نقصان پہنچا ہے اور عازمینِ سفر کی آمد و رفت ایک روز تک مسدود رہی، لیکن اب سلسلۂ حمل ونقل جاری ہے۔"

اُن پڑھ بیوی کے بہت فائدے ہوتے ہیں اور یہاں تو منشی فاضل کی ڈگری بھی کام نہ آسکتی تھی۔ اس لئے مُنہ بسور کر کہنے لگی "اس کا یہی مطلب ہوگا نا کہ وہاں بہت سردی پڑتی ہے"۔ لیکن ہمیں تو ان اخباروں کا اعتبار نہیں۔ تم ہو کہ ان کو قرآن و حدیث کی طرح سچا مانتے ہو۔ کبھی کہتے ہو کہ ایک عورت نے پانچ بچے جنے۔ کبھی سناتے ہو کہ فلاں مقام پر زمین سے آگ کے شعلے نکلے۔ فلاں جگہ پر نحوان کی بارش ہوئی۔ فلاں ملک میں جنگ ہونے والی ہے۔ فلاں مُلک میں ایک گائے کو چھ ٹانگوں والا بچھڑا پیدا ہوا تو فلاں مُلک میں بندر کے غدود کے ذریعے بڈھوں کو نوجوان بنا دیتے ہیں۔ بھلا میں پوچھتی ہوں کہ انسان کہیں خدا کے کاموں میں بھی دخل دے سکتا ہے اور وہ ڈاکٹر کہاں کا افلاطون ہوگا۔ جو انسان کی کھوئی ہوئی جوانی واپس لا دے اور اسے مرنے نہ دے۔ موت سے تو خود افلاطون نہ بچ سکا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس نے عزرائیل کو دھوکا دینے کے لئے اپنی شکل کے کئی انسان بنوائے اور خود ان کے درمیان مل گیا۔ لیکن یہ بھی کوئی افلاطون کی خدائی تھی؟ حضرت عزرائیل نے فوراً اصلی افلاطون کو پہچان لیا اور اسکی روح قبض کر لی ——— میں حیران ہوں کہ یہ اخبار والے

جو خدائی دعوے باندھتے ہیں اور دن رات جھوٹ بولتے رہتے ہیں۔ قیامت کے دن کیب جواب دیں گے ؟ خدا غارت کرے ان ـــــ "

ہم نے شکر کیا کہ ہمیں کامیابی ہوئی اور ہمارے سر سے بلا ٹل کر اخبار والوں پر جا پڑی۔ جب وہ خاموش ہوئیں تو ہم نے مذکورہ بالا اقتباس کے آخری حصہ کو داغنع کیا یعنی بتایا کہ ریلوے لائن کی حالت خطرناک ہے ـــــ اس سے ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہم شملہ میں مہینہ ڈیڑھ مہینہ رہنا چاہتے تھے اور اجمیر شریف کے عرس کے لئے چند روز کافی ہوتے ہیں۔ ہم نے سوچا کہ پانچ چھ روز کے بعد چٹھی لکھ دیں گے کہ ریلوے لائن ٹوٹ گئی۔ جب اس کی مرمت ہو جائیگی تو آئیں گے۔

عشاء کی نماز اوّل وقت پڑھکر ہم سیدھے اسٹیشن پہنچے اور کالکا میل میں سوار ہو گئے۔ ہمارے دوست دیکھنے آئے۔ دیکھا کہ ہم تھرڈ کلاس میں بیٹھے ہیں۔ پوچھا کہ یہ کیا کفایت شعاری کا موقعہ ہے۔ ہم نے جواب دیا کہ ہم اور گاندھی جی ان باتوں کو آپ لوگوں کی نسبت بہتر سمجھتے ہیں۔

گاڑی چلی اور تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد نیم دراز ہو گئے، پھر لوپرے لیٹ گئے اور پھر پورے سو گئے۔ ہم نے خواب میں دیکھا ـــــ لیکن خواب کی باتوں پر آج کل کون اعتبار کرتا ہے لوگ خدا کی ہستی تک کے منکر ہو رہے ہیں۔ سائنسدان کہتے ہیں کہ ہمیں دکھاؤ خدا کیا ہے اور کہاں ہے ؟ خدا کا تو خیر ظاہرا کوئی وجود نہیں۔ یہ کمبخت لوگ مرئی چیزوں تک کے وجود سے انکار کر رہے ہیں ـــــ فلاسفروں کا ایک فرقہ کہتا ہے کہ مادہ غیر حقیقی ہے۔ یعنی اینٹ، پتھر قلم، کاغذ، مصری شاہ۔ انقلاب کا دفتر، حاجی لق لق کوئی چیز نہیں ـــــ ان اعتقادات کے ہوتے ہوئے ہم اپنا خواب کسے سنائیں۔ ان منطقیوں کے دلائل بھی کچھ ایسے زبردست

ہیں کہ مولوی ثناء اللہ، مولوی دیدار علی شاہ، سنگل سائیں اور لکھنؤ والے مولوی صاحب کے پاس کوئی جواب نہیں، البتہ خدا کے منکروں کو حضرت اکبر الٰہ آبادی نے جواب دیا تھا کہ:۔

خدا کے باب میں یہ غور کیا ہے؟
خدا کیا ہے، خدا ہے اور کیا ہے؟

اور مادہ کو غیر حقیقی ماننے والوں کے جواب میں انگلستان کے ایک مشہور مدبر نے کہا تھا کہ ـــــ "حضرت ایک چٹان کے ساتھ ٹکر لگا کر سر پھوڑ لیجئے۔ پھر آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ مادہ کوئی چیز ہے یا نہیں۔

بہر حال خواب کی باتوں کو چھوڑئیے اور سنئے کہ جب ہم بیدار ہوتے تو گاڑی ایک اسٹیشن پر کھڑی تھی ـــــ ایک لالہ جی جینیو کان پر ڈالے ٹٹی میں گھس رہے تھے اور ایک خالصہ جی نہایت یکسوئی اور ترنم کے ساتھ پوتھی پڑھ رہے تھے۔ ٹرین کے باہر دور و نزدیک سر سبز پہاڑیاں نظر آرہی تھیں۔

چند منٹ کے بعد گاڑی روانہ ہوئی اور جب کالکا کا سٹیشن قریب آگیا تو پوتھی پڑھنے والے خالصہ جی نے ایک سوٹ کیس کھولا اور چند لمحوں میں انگریزی وضع کا سوٹ اور کالر نکٹائی پہنکر صاحب بن گئے۔

ہمیں اس وقت بہت خوشی حاصل ہوئی کہ ایک "اپ ٹوڈیٹ" خالصہ جنٹلمین میں مغربی زندگی کے باوجود اپنے مذہبی فرائض کا احساس موجود ہے۔ اس کی بجائے اگر کوئی مسلمان "جنٹلمین" ہوتا تو نماز کی نشست و برخاست سے اپنی انگریزی "وضع" کو بٹہ نہ لگاتا اور یہ تو سفر کی حالت تھی جبکہ بے سوٹ کے مسلمان بھی نماز روزہ کی معافی کا جواز نکال لیتے ہیں لیکن گھر میں بیٹھے بھی کتنے سوٹ پوش مسلمان ہیں جو نماز اور سوٹ کو ایک گھاٹ پانی پلا سکیں؟

خدا کا شکر ہے کہ ہم سوٹ بوٹ سے بے نیاز تھے۔ اس لئے ہم نے اُٹھ کر وضو کیا اور نمازِ فجر ادا کی۔

باہر کا منظر دلفریب تھا، دیدہ فریب تھا اور اپنی فریب کاریوں کے باعث گویا جرم زیرِ دفعہ ۴۲۰ کا مرتکب ہو رہا تھا۔ ہم نے اپنی گردن کھڑکی سے باہر نکال کر دیکھا تو چلتے چلتے دفعتہً :-

ریل خم کھا کے ہلالِ چرخ گردوں ہو گئی

ہم نے آگے کی طرف نگاہ دوڑائی تو پورا انجن نظر آنے لگا لیکن بریک کی طرف جو دیکھا تو وہاں بھی بریک کی جگہ انجن ہی دکھائی دیا۔ ہم نے پھر اگلے انجن کی طرف دیکھا۔ آگے بھی انجن، پیچھے بھی انجن، یا مظہر العجائب! ڈرائیور موجود، گارڈ غائب۔ یہ کیا معاملہ ہے؟

ہمیں اس معاملہ کے سمجھنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ کیونکہ آخر مڈل پاس تو تھے ہی۔ ذرا سا غور کرنے پر واضح ہو گیا کہ پہاڑی علاقہ ہے اور راستے میں چڑھائی بہت ہے۔ اس لئے دو انجن لگا دیئے گئے ہیں۔ کہ اگلا انجن کھینچے اور پچھلا دھکیلے۔

لیکن ہمیں حیرت تھی تو اس بات پر کہ انگریزوں کے انجنوں تک میں پھوٹ نہیں پڑتی نہایت یک جہتی اور خان بہادروں کی سی وفاداری سے ٹرین کو لئے جا رہے ہیں اگر انگریزوں کی بجائے یہ انجن ہندوستانیوں کے ہوتے تو یقیناً ایک مہا سبھائی ہوتا اور دوسرا کانگرسی ——— اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ ہمارے گھر والوں کے لئے "اجمیر شریف" کی ریلوے لائن ایسی ٹوٹتی کہ قیامت سے پہلے اس کی مرمت ناممکن ہو جاتی۔

ہم نے شکر کیا کہ ابھی تک ہمیں ہوم رول نہیں ملا۔ ورنہ اگر اگلے انجن کے ڈرائیور مولانا شوکت علی اور پچھلے انجن کے ڈرائیور بھائی پرمانند ہوتے تو ہماری ٹرین کا کیا حشر ہوتا؟ یہ

اپنی طرف کھینچتے۔ وہ اپنی طرف کھینچتے اور اس کشمکش میں مسافروں کو حضرتِ عزرائیل اپنی طرف کھینچ لیتے۔

لیکن اگر بفرضِ محال ڈرائیور لوگوں میں کوئی "لکھنو پیکٹ" ہو بھی جاتا تو مسافر اسے قائم نہ رہنے دیتے۔ مثلاً مسلمان مسافر گڑھ کے اسٹیشن پر مولانا شوکت علی سے درخواست کرتے کہ حضرت ٹرین کو رکے رکھئے۔ ہم پلیٹ فارم پر باقاعدہ اذان کہکر نماز باجماعت ادا کرنا چاہتے ہیں۔ سکھ مسافر بگڑ جاتے کہ وہ اپنے ڈبے کے قریب اذان نہیں کہنے دیں گے۔ ہندو مسافر بھائی پرمانند سے اصرار کرتے کہ مہاراج گاڑی چلائیے۔ اشنان کے وقت کا لکا پہنچنا ضروری ہے غرض یہ لے دے بڑھ کر "فساداتِ آگرہ" کی صورت اختیار کر لیتی۔

ہم انہیں خیالات میں محو تھے کہ سامنے کی سڑک پر جو ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ جاتی ہے۔ ایک برات گذر رہی تھی۔ اور باجہ والوں نے غالباً ٹرین کے مسافروں سے اپنا پتیل منوانے کے لئے نغمہ سرائی شروع کر دی۔ اس پر ہم پھر خدا کا شکر بجالائے کہ ہماری ٹرین انگریزی ہے اور "پاکستانی" نہیں۔ ورنہ کسی مسافر کے زنجیر کھینچنے پر ٹرین فوراً رک جاتی۔ اگلے انجن سے ڈاکٹر اقبال اور پچھلے انجن سے چودھری رحمت علی آف لنڈن بھاگے ہوئے آتے اور مسافر مذکور سے ٹرین ٹھہرانے کا سبب پوچھتے۔ مومن صفت مسافر صاحب برات کے باجے کیطرف اشارہ کرتے اور کہتے "دیکھئے صاحب ان بدبختوں نے یہاں تک نہیں سوچا کہ ممکن ہے کوئی شخص گاڑی میں نماز پڑھ رہا ہو اور باجہ بجانا شروع کر دیا ہے۔ اب ذرا ٹرین کو ٹھہرائے رکھئے تاوقتیکہ ہم ان کو اس حرکت کی سزا دے لیں۔

ہم اس قسم کے "ریلوے خیالات" میں غرق تھے اور ساتھ ساتھ سرسبز و شاداب نظاروں کا لطف بھی اٹھاتے جا رہے تھے کہ یکایک ہمارے کانوں نے انجن کے چار وسل سنے ہم حیران

تھے کہ کیا ٹرین کیسا تھ دو کی بجائے چار انجن لگ گئے۔ گردن بڑھا کر ٹرین کے آگے پیچھے نگاہ دوڑائی تو معلوم ہوا کہ انجن وہی دو کے دو ہیں! یہاں "مڈل پاسی" اور سیاستدانی دونوں کام آئیں اور ہم نے سمجھ لیا کہ دو آوازیں انجنوں کی اپنی تھیں اور دو جی حضوریے ممبران کونسل کی آواز کی طرح صدائے بازگشت تھی جو پہاڑیوں سے ٹکرا کر واپس آئی۔

کالکا آپہنچا اور ہم اتر کر اسٹیشن سے باہر نکلے۔ خیال تھا کہ کالکا سے شملہ تک موٹر میں جائیں گے۔ لیکن دیکھا کہ وہاں نہ کوئی موٹر تھی نہ ٹانگہ ہم ادھر اُدھر بھاگے دوڑے۔ بابوؤں اور پولیس والوں سے پوچھا۔ مسٹر ایم۔ اے غنی اور مسٹر ایم۔ اے خان کی دہائی دی لیکن کوئی سواری نہ ملی۔ آخر وجہ یہ معلوم ہوئی کہ حضور وائسرائے شملہ سے کالکا آرہے ہیں۔ اس لئے سڑک مرمت کیلئے نہیں بلکہ وائسرائے کے لئے بند ہے *

# پھر شملہ کی سیر

(حاجی لق لق کے پاؤں سے)

"پاؤں سے" کا یہ مطلب نہیں کہ ہم نے خدانخواستہ یہ مضمون اپنے پاؤں سے لکھا بلکہ یہ کہ ہم نے شملہ کی سیر اپنے پاؤں چل پھر کر کی۔ کیونکہ وہاں گاندھی جی کے سوا کسی اور انسان کو آج تک موٹر کے جانے کی اجازت نہیں ملی اور گاندھی جی کو بھی اسلئے اجازت مل گئی تھی کہ انہوں نے رکشا پر سوار ہونے سے انکار کر دیا تھا ——— مہاتما نے کہا تھا کہ میں ایسی چیز پر سوار ہونا نہیں چاہتا جسے مجھ جیسے انسان کھینچیں۔ رکشا ایک قسم کی گاڑی ہے جسے تانگے کا شیر خوار بچہ کہنا چاہیئے۔ دو آدمی اسے آگے سے کھینچتے ہیں اور دو پیچھے سے دھکیلتے ہیں۔ ہم چونکہ مسلمان اور ایماندار آدمی ہیں یعنی قرشی صاحب کے اخبار "ایمان" کے خریدار ہیں۔ اسلئے ہم میں اس قدر "گاندھیت" موجود ہے کہ ہم ایسی گاڑی میں سوار نہ ہوں جسے انسان چلائیں۔ معترض کہہ سکتا ہے کہ موٹر اور ریل کو بھی تو آخر انسان ہی چلاتے ہیں۔ لیکن بھئی اگر آپ ان رکشا ڈرائیوروں کی حالت دیکھیں تو آپ کو ان بیچاروں کی حالت پر ضرور رحم

آجائے گا اور آپ کبھی رکشا پر سوار ہونا پسند نہ کریں گے۔ یہ اور بات ہے کہ کسی مجبوری کے باعث یا تجربہ کے طور پر آپ ایک آدھ دفعہ یہ گناہ کر بیٹھیں جیسا کہ ہم نے ایک دفعہ کیا اور جس کا اقرار ہم صرف اس لیے کر رہے ہیں کہ مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی نے ہمیں مال روڈ پر رکشا میں جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور سلام علیکم بھی کچھ اس انداز سے کہا تھا کہ گویا کہہ رہے ہیں "ہمیں الزام دیتے تھے، اب تم بتاؤ ؟"

لاہور سے ٹرین میں سوار ہوئے تو چلا چل چلا چل جالندھر شہر کے اسٹیشن پر پہنچے۔ بورڈ پہ "جالندھر شہر" لکھا ہوا نظر سے گذرا تو فوراً حفیظ المعروف بہ حفیظ جالندھری جالوار دنحال قعداحبٔ والحاج ساکن موضع ماڈل ٹاؤن ثم لنڈن کی شکل آنکھوں میں پھر گئی اور کئی ایسی صحبتیں یاد آگئیں جن پر جالندھر فخر کر سکتا ہے۔ وہ زمانہ یاد آگیا جبکہ ہم اور حفیظ فکر جاہ طلبی اور ہوس خالصاحبی سے آزاد نوجوانی یا چشم بد دور کم سنی کی بے پروا زندگی بسر کرتے تھے۔ قسمت نے پلٹا کھایا ہمارے عزیز ترین دوست کو خدا نے اس دنیا میں عزت بخشی۔ وہ فردوسیٔ اسلام بنے، خالصاحب ہوئے۔ روضۂ شاہِ دوجہاں کی زیارت سے مشرف ہوئے، زائرِ لنڈن بنے اور آج اس قابل ہیں کہ اگر خدانخواستہ ان کا دم برابر ہو جائے تو کسی چوراہے میں ان کی یادگار قائم کی جائے۔ "جالندھر سٹیشن" کے الفاظ سے ہمیں نفرت ہوگئی اور ہم نے دل میں خیال کیا کہ جس جالندھر نے اتنا صاحب دماغ آدمی پیدا کیا ہے۔ کیا اس جالندھر کا نام بدل کر حفیظ پور نہیں رکھا جا سکتا ؟

ٹرین جالندھر شہر سے روانہ ہوئی اور ہم اس بات پر زیادہ متانت کیساتھ غور کرنے لگے۔ دل نے کہا کہ اگر ایک انگریز کے نام پر ایک اسٹیشن کا نام واربرٹن ہو سکتا ہے۔ یا ایک شہر کو لائل پور کہا جا سکتا ہے تو کیا وجہ ہے کہ جالندھر کا نام حفیظ پور نہ ہو، کیا حفیظ ہندوستان

کے نامور ترین شاعروں میں سے نہیں؟ گیا اس کی ناموری معمولی اشتہار بازی اور احسان محسنین سے پاک نہیں؟ ٹرین ٹھہری اور ہمارے خیالات کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہم نے آنکھ اٹھا کر دیکھا۔ اگلا اسٹیشن آچکا تھا اور ہماری آنکھوں کے عین سامنے اشتہار آویزاں تھا "ہدایت نامۂ خاوند" پانی والا پکارا۔ جالندھر چھاؤنی "مسلمان پانی"

جالندھر چھاؤنی سے انبالہ۔ انبالہ سے کالکا اور کالکا سے شملہ پہنچے۔ کالکا میں ہم نے ٹھنڈا لباس اُتار کر گرم کپڑے پہن لئے تھے اور حیران تھے کہ لاہور والوں نے کیا قصور کیا ہے کہ وہاں گرمی کے مارے لوگوں کا دم نکلا جا رہا تھا اور یہاں کالکا سے ایسی سردی شروع ہو گئی ہے کہ موٹر میں کمبل اوڑھنے کی ضرورت پڑ گئی ہے؟

شملہ میں ہمارے دوست ہمیں ایک پارٹی میں لے گئے۔ جہاں ایک سرے سے دوسرے سرے تک سر، خان بہادر، راجکمار اور وزراء جلوہ افروز تھے۔ ہمارے دوست ہمیں ایک صوفے پر بٹھا کر خود ایک بڑے آدمی کے پاس جا بیٹھے۔ ہمارے دائیں ہاتھ جو صاحب بیٹھے تھے وہ ہمارے لئے "غنیمت" تھے اور ہم یہ کہیں گے کہ ہم اس فخرِ ہمسائیگی پر بڑے نازاں تھے۔ بائیں طرف ایک امرتسری صاحب تھے اور ان کے بائیں طرف خان بہادر ڈاکٹر جعفری ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعاتِ ہند رونق فرما تھے۔ ہوٹل والوں نے مہمانوں کے لئے دو دو چھوٹی میزیں ملا کر ان پر سامانِ خورد و نوش بڑے سلیقہ کے ساتھ چن رکھا تھا لیکن جعفری صاحب نے خدا جانے کس مصلحت کی بنا پر ایک میز کھینچ کر علیحدہ کر لی یعنی اپنے قریب کر لی۔ اب ہماری بدقسمتی دیکھئے کہ جو میز ہمارے حصہ میں آئی۔ اس پر صرف معمولی بسکٹوں کی ایک دو تھالیاں تھیں یا چائے کی کیتلی۔ جو میز جعفری صاحب نے کھینچ لی۔ اس پر اعلیٰ درجہ کی مٹھائی، دودھ اور چینی تھی۔ جب ڈائس پر سے آرکسٹرا کے نغمے بلند ہوئے اور کھانے پینے کا دور شروع ہوا تو

جعفری صاحب نے ہماری میز کی طرف دیکھکر فرمایا کہ حضرت کوئی صاحب پیالیوں ہی چاٹتے ڈالیں، ہمارے امرتسری دوست نے یہ فرض ادا کیا۔ چائے ہم نے دی اور دودھ چینی جعفری صاحب کی میز سے حاصل کیا گیا۔ لیکن کھانے کے لئے ہمارے پاس وہی چار آنے پونڈ والے بسکٹ تھے اور جعفری صاحب کے سامنے مکھن زدہ مٹھائی، ہم نے امرتسری بزرگوار سے عرض کیا کہ ہاتھ بڑھا کر تھوڑی سی مٹھائی اُٹھا لیجئے لیکن وہ فرمانے لگے کہ صاحب مجھے معاف فرمایئے جعفری صاحب ہمارے افسر ہیں، میں یہ گستاخی نہیں کر سکتا۔ ہم نے عرض کیا کہ صاحب اگر جعفری صاحب آپ کے افسر ہیں تو آپ کو چاہئے کہ آپ زمین پر بیٹھیں۔ افسر کے برابر بیٹھنا کس کتاب میں لکھا ہے؟ آپ قالین پر براجمان ہو جائیے۔ ہم آپ کو چائے بسکٹ وہیں پہنچا دیں گے۔ لیکن امرتسری صاحب اس بات پر رضا مند نہ ہوتے۔ اس کے بعد ہوٹل کا ایک ملازم آیا اور ایک خوبصورت کیک ہماری میز پر بھولا یا ارادتاً رکھکر چلا گیا۔ ہم نے امرتسری صاحب سے کہا کہ یہ کیک ہماری طرف سے جعفری صاحب کی خدمت میں پیش کر دیجئے اور پوچھئے کہ کوئی اور کار خدمت؟ اس پر امرتسری صاحب پھر بولے کہ جعفری صاحب میرے افسر ہیں میں یہ گستاخی نہیں کر سکتا۔ ہم حیران تھے کہ جعفری صاحب سے مٹھائی لینا بھی گستاخی اور انہیں مٹھائی دینا بھی گستاخی۔ ہم نہ رہ سکے اور ہم نے امرتسری صاحب سے یہ بات کہدی۔ آپ نے جواب میں فرمایا کہ حضرت کیا کریں۔ اسی کا نام ہے افسری اور ماتحتی!

لیکن ہمیں اس بات پر حیرت تھی کہ جعفری صاحب نے یہ کیسے معلوم کر لیا کہ ہم بھی ان کی رعیت میں یعنی ایک اخبار میں کام کرتے ہیں۔ اگر انہیں یہ معلوم نہ ہوتا تو وہ کبھی میز کھینچنے کی جرأت نہ کرتے۔ بہر حال محکمۂ اطلاعاتِ ہند کے ڈائرکٹر صاحب کی قیافہ شناسی کی داد دیئے بغیر چارہ نہیں!

اس مجلس میں ہمیں ایک بزرگوار کی حرکات دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ آپ نے بیٹھتے ہی ادھر

ادھر دیکھنا شروع کیا۔ ایک میز کے گرد تین چار بڑے آدمی جن میں سے ایک وزیرِ حکومتِ پنجاب بھی تھا، بیٹھے تھے حضرت وہاں تشریف لے گئے۔ پھر ایک اور میز تاڑ کر وہاں پہنچے۔ اس کے بعد جو بڑا آدمی آپ کی نظر سے گذرا جھٹ اس کے پاس گئے اور فرمایا کہ آپ مجھے جانتے ہیں؟ میں ——— کا بیٹا ہوں۔ جواب ملا "مزاج اچھا ہے؟" آپ کے والد سے مجھے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا۔ کہئے آپ کے والد صاحب بخیریت ہیں؟ شکریہ!

ہم نے یہ حرکات دیکھ کر چاہا کہ ہم ہر بڑے آدمی کے پاس جا کر کہیں "آداب عرض حضرت! خاکسار حضرتِ آدم کی اولاد حاجی لق لق ہے۔ کہئے، مزاج کیسا ہے؟" وغیرہ

رات کے وقت ہم نے ایک مجلس میں مولوی مفتی حاجی حکیم طبیب ابو تراب عبدالحق امرتسری کو موجود پایا۔ آپ بڑے آدمی ہیں "مدینہ" اور "انقلاب" کے ایڈیٹروں کو آپ سے خاص محبت ہے۔ سندباد جہازی آپ سے عقیدت رکھتے ہیں۔ اہلِ مجلس کے لئے آپ کا دم غنیمت تھا۔ ہر طرف سے طبی اور دینی استفسارات کی بوچھاڑ شروع ہو گئی لیکن حکیم صاحب تھے کہ ہر مستفسر کی تسلی کر دیتے تھے۔ ایک صاحب نے پوچھا کہ حضرت! اگر معشوق پر نظر پڑ جائے اور شوقِ نظر بازی کی تسلی کے لئے اس پر ایک اور نگاہ ڈالی جائے تو اس نگاہِ ثانی کے متعلق شرع کا فتویٰ کیا ہے؟ مفتی صاحب نے فرمایا کہ دوسری شرعاً حرام ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ دوسری نظر کی نوبت ہی کیوں آئے اور پہلی نظر ہی میں کیوں نہ معاملہ ختم کر لیا جائے؟

ایک مریض صاحب نے عرض کیا کہ حضرت سنا ہے۔ آپ قوتِ باہ کے لئے اچھی اچھی ادویہ رکھتے ہیں؟ حکیم صاحب نے فرمایا "میں مجسم قوتِ باہ ہوں"

# دیسی لاٹ صاحب

لاٹ صاحب کا عہدہ تو ایک بڑی چیز ہے۔ آج سے چند سال پہلے سودیشی ڈپٹی کمشنر کا تصور کرنا بھی مشکل تھا۔ گورنر، کمشنر، ڈپٹی کمشنر وغیرہ عہدوں کا خیال آتے ہی آنکھوں کے سامنے سُرخ و سفید چینی کے انسان پھرنے لگتے تھے اور کانوں میں "ڈیم فول" کے الفاظ گونجنے لگتے تھے۔ خدا بھلا کرے گاندھی جی مہاراج کا اور اُن کے چرخے کا کہ کھدر کے ساتھ برٹش عہدوں پر بھی سودیشی انسان متمکن ہونے لگے اور ایک وقت آیا جبکہ پنجاب کے سب سے بڑے حاکم یعنی لاٹ صاحب کے عہدے پر بھی ایک دیسی بزرگوار فائز ہو گئے۔

ہم نے بہت عرصہ پہلے ایک انگریز لاٹ صاحب کو دیکھا تھا جو ہاتھی پر سوار ہو کر بڑے تزک و احتشام کے ساتھ دہلی دروازہ میں داخل ہوتے تھے۔ لیکن ہمیں یہ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ لاٹ صاحب بولا بھی کرتے ہیں یا صرف دیکھنے ہی کے کام آتے ہیں۔ ہم نے دیکھا کہ یہ گورے لاٹ صاحب آنکھیں بھی جھپکتے تھے۔ مسکراتے بھی تھے اور کبھی

کبھی تماشا بیوں کے سلام کے جواب میں اپنا ہاتھ بھی ماتھے کے قریب لے جاتے تھے لیکن یہ معمہ حل نہ ہو سکا کہ وہ بولتے بھی ہیں یا نہیں۔ اگر بولتے ہیں تو کہاں سے ؟

جب ہم نے لاہور میں دیسی لاٹ صاحب کے تقرر کی خبر سُنی تو جی میں آئی کہ یہ تو اپنے ہی ملک کے باشندے ہیں اور سُنا ہے کہ بڑے خلیق اور سادہ مزاج ہیں۔ آؤ، ذرا ان سے ملاقات کرنے کی کوئی تجویز سوچیں۔ پہلے ہم نے سوچا کہ ایک کیمرہ خریدیں اور جلدی جلدی فوٹو اُتارنے کا فن سیکھیں۔ اس کے بعد بغل میں کیمرہ دبائے یہ شعر پڑھتے ہوئے لاٹ صاحب کی کوٹھی کی طرف روانہ ہو جائیں سے

سیکھے ہیں مہ رُخوں کے لئے ہم مصوری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہئے

لیکن بدقسمتی سے نہ تو لاٹ صاحب مہ رُخ تھے اور نہ ہمارے پاس کیمرہ خریدنے کے لئے دام تھے۔ اس لئے سوچا کہ ع

یار سے ملنے کی اے دل اور ہی ترکیب کر

ترکیب ہمارے ذہن میں آ گئی۔ ہم نے چار مصرعوں کا ایک مرصّع قطعہ کہا، اور اسے ایک خوبصورت کاغذ پر اچھے خوشنویس سے لکھوایا۔ اس کے بعد لباس کا مرحلہ ہمارے سامنے آیا۔ جیسے ہم نے یوں طے کیا کہ پاجامے کی جگہ لٹھے کی چادر باندھ لی۔ کوٹ اُتار کے پھینک دیا۔ سر پر لمبا کلاہ اور ایک گز طرّہ والی سفید پگڑی جہلمی بندش کی سجائی۔ قطعہ لمبی قمیص کی جیب میں ڈالا اور گورنمنٹ ہوس کی طرف چل دیئے

گورنمنٹ ہوس کے پھاٹک پر زبردست پہرہ تھا۔ جب ہم وہاں سے گزرنے لگے تو سپاہی نے ٹوکا اور پوچھا: تم کون ہو اور کہاں جا رہے ہو؟

ہم نے پورے دیہاتی انداز میں کہا "یہ جانتے نہیں ہو کہ ہم کون ہیں؟ ہم لاٹ صاحب کے بھائی بند ہیں اور ان کے گاؤں سے آ رہے ہیں"۔ سپاہی بولا "لیکن اندر جانے کی اجازت نہیں" ہم نے بگڑ کر کہا "اچھا؟ لاٹ صاحب کے بھائیوں کو بھی اندر جانے کی اجازت نہیں؟ اگر ایسا ہے تو ہم بھائی صاحب کو مجبور کرینگے کہ وہ ایسی نوکری فوراً چھوڑ دیں جس میں بھائی بھائی کو نہیں مل سکتا۔ یہ اچھی نوکری ہے کہ بھائی اتنی دور سے چل کر ملنے آئے اور یہاں ٹھیکری پہرے والے آگے ہی نہ جانے دیں۔ ہمیں ایسی نوکری کی ضرورت نہیں!"

سپاہی ٹھیکری پہرے کا نام سُنکر بہت ہنسا اور اُس نے ہمیں اندر جانے کی اجازت دیدی لیکن کوٹھی کے باہر ایک اردلی نے ہمیں روکا۔ اس سے بھی ہم نے وہی کچھ کہا۔ جو باہر والے سنتری صاحب سے کہا تھا۔ اردلی نے کہا "آپ کچھ لکھ پڑھ سکتے ہیں؟" ہم نے کہا "ہاں، پرائمری پاس ہیں" اردلی لپک کر ایک پنسل اور کاغذ لے آیا اور بولا کہ آپ لاٹ صاحب کے لئے رقعہ لکھ دیجئے ہم نے لکھ دیا کہ "حضور والا۔ صرف آپ کی زیارت درکار ہے۔ دیگر کوئی مقصد نہیں"

اردلی ہمارا رقعہ لیکر اندر گیا اور چند لمحوں میں واپس آکر بولا "چلئے لاٹ صاحب یاد فرماتے ہیں" ہم اردلی کے پیچھے پیچھے ایک کمرے میں داخل ہوئے۔ وہاں لاٹ صاحب ایک صوفے پر ہمارے منتظر بیٹھے تھے۔ ہم نے سلام علیکم عرض کیا۔ لاٹ صاحب نے مصافحہ کر کے ہمیں بیٹھ جانے کو کہا اور خیر و عافیت پوچھی۔ ہم جیب سے قطعہ نکال کر اپنے دونوں ہاتھوں پر رکھا اور بڑے ادب کیساتھ سر جھکا کر پیش کر دیا۔ لاٹ صاحب نے قطعہ پڑھا اور مسکرا کر ہمارا شکریہ ادا کرنے لگے۔ ہم نے ان کے شکریے کا شکریہ ادا کیا اور لاٹ صاحب نے جیب سے بٹوہ نکال کر دس دس روپے کے دو نوٹ ہماری طرف بڑھائے اور کہا "یہ ہے آپ کا پان سگریٹ۔ اور یاد رکھئے کہ جو لوگ مجھے بہت امیر خیال کرتے ہیں۔ وہ غلطی پر ہیں۔ جتنا بڑا عہدہ اتنے بڑے اخراجات۔ میں جانتا ہوں کہ آپ کے قطعہ کے لئے

۲۰ روپے دینا آپ کی توہین کرنا ہے۔ لیکن کیا کروں؟ جیب اس سے زیادہ کی اجازت نہیں دیتی۔"

ہم شرمسار سے ہو گئے اور ہم نے عرض کیا کہ جناب، غرض صرف آپ کی زیارت تھی لیکن لاٹ صاحب مصر تھے کہ ہم بیس روپے ضرور قبول کر لیں۔ وہ نوٹ ہماری طرف دھکیل رہے تھے اور دل میں خیال کر رہے تھے کہ شاعر مغرور ہے قسم و یکھکر خفا ہو گیا ہے اور زیادہ چاہتا ہے۔ ہم شرمندہ ہو رہے تھے کہ لاٹ صاحب بے ادبی کا اگر تصور کر رہے ہیں غرض جب ہم نے قسم کھا کر کہا کہ ہم کسی انعام و اکرام کے لئے نہیں آئے تو خدا خدا کر کے لاٹ صاحب نے نوٹ واپس بٹوے میں ڈال لئے۔

پاس کے کمرے میں سے آوازیں آرہی تھیں اور قہقہے بلند ہو رہے تھے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ لاٹ صاحب کے کوئی یار دوست وہاں بیٹھے ہیں۔ دفعتاً اس کمرے سے کسی نے لاٹ صاحب کو آواز دی اور آپ مجھ سے یہ کہکر بھاگ گئے کہ معافی چاہتا ہوں

اُدھر لاٹ صاحب دوسرے کمرے میں گئے اور ادھر ان کی چھوٹی بچی ہمارے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک ٹارچ تھی۔ ہم نے بچی کو پاس بلا کر اسے پیار کیا اور بچوں کی بولی میں اس سے باتیں کرنے لگے۔ تمہارا نام کیا ہے؟ کتنے بھائی بہن ہو تم کونسی کلاس میں پڑھتی ہو یا نہیں؟ آج سالن کیا پکا تھا؟ وغیرہ وغیرہ

بچی بڑے پیارے لہجے میں جواب دیتی گئی اور آخر میں کہنے لگی کہ میری بیٹری نہیں جلتی اسے جلا دو۔ ہم نے ٹارچ کو اپنے ہاتھ میں لیکر دیکھا تو معلوم ہوا کہ مصالحہ ختم ہو چکا ہے۔ ہم نے کہا کہ "اچھی خاتون! اس کا مصالحہ ختم ہو چکا ہے۔"

بچی بولی "مصالحہ کہاں سے ملیگا؟"

ہم نے جواب دیا کہ "باورچی خانہ سے"!

یہ سُنکر بچی جس دروازے سے آئی تھی، بھاگ کر اسی دروازے سے نکل گئی اور ایک منٹ میں واپس آئی۔ اس کی مٹھی میں نمک مرچ مصالحہ تھا۔ وہ بولی "لیجئے، میں مصالحہ لے آئی ہوں۔ اب میری ہنڈیری جلا دیجئے"۔

ہم نے ہنڈیری کا مُنہ کھول کر بچی سے کہا کہ مصالحہ اس میں ڈال دو۔ وُہ مصالحہ ڈال رہی تھی کہ باہر سے ایک آواز آئی۔ بچی نے اِدھر نگاہ اٹھائی تو ایک نووارد کو دیکھکر اسکی طرف بھاگ گئی۔ یہ نووارد لاٹ صاحب کے بڑے بھائی تھے اور کوٹھی کے باہر کھڑے اردلی کو آواز دے رہے تھے۔ بچی اپنے تاؤ کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ لیکن چونکہ اس کے ہاتھ مصالحہ میں لتھڑے ہوتے تھے۔ اس لئے مصالحہ نواب صاحب کی تپتلون پر لگ گیا۔ انہوں نے ذرا کرخت لہجہ میں بچی کو ڈانٹا۔ تو وہ رونے لگی۔ روتے وقت جب اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھوں کو ملا تو مصالحہ اس کی آنکھوں میں پڑ گیا اور وہ دہائی دینے لگی۔

لاٹ صاحب اور ان کے دوست بھی باہر نکل آتے اور بچیؔ کے ہاتھوں کو دیکھکر غضب میں آگئے کہ اس کے ہاتھوں کو مصالحہ کس نے لگا دیا؟

نوکروں، اردلیوں کو آوازیں دی جانے لگیں اور تحقیقات شروع ہوگئی کہ لڑکی کے ہاتھوں کو مصالحہ کیسے لگ گیا۔ ہم نے کھڑکی سے یہ سب کچھ دیکھا تو سمجھے کہ اپنی خیر نہیں چنانچہ ہم پچھلے دروازے سے چوروں کی طرح نکلے اور جھاڑیوں کی اوٹ میں چھپتے چھپاتے پھاٹک تک پہنچے۔ خدا کا شکر ہے۔ کہ کھلبلی مچ جانے کے باعث کسی نے ہم کو کھسکتے ہوئے نہ دیکھا اور ہم بخیریت پھاٹک کے باہر پہنچ گئے۔

گھر پہنچکر دو تین روز تک ہمیں یہی کھٹکا لگا رہا کہ ابھی کوئی پولیس والا بلانے آئیگا

لیکن جب کوئی بُلاوا نہ آیا تو ہمیں معلوم ہو گیا کہ انگریز لاٹ صاحب اور دیسی لاٹ صاحب میں کیا فرق ہے۔ انگریز صاحب ہوتا تو ہم چکّی پیسنے کا فن سیکھ لیتے۔

# بوتل

مَیں نے لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے بوتل کو اٹھایا اور مئے گلرنگ کا ایک "پیگ" گلاس میں ڈالا ——— بوتل نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا "نوش جان" یوں تو پرانی داستانوں میں بھی آیا کہ پچھلے زمانوں میں خدا نے چکوے چکوی کو نطقِ انسانی بخش دیا تھا اور پھر "کلیلہ ومنہ" میں تو شجر و حجر، وحوش وطیور سب انسان ہی کی طرح بات چیت کرتے نظر آتے تھے۔ لیکن زمانۂ حال کی سائنس نے اِن مفروضات کو حقیقت کا رنگ دے دیا ہے اور "ہز ماسٹرز وائس" نے لکڑی اور لوہے میں ایسی رُوح پھونک دی ہے کہ آپ گھر بیٹھے رفیق غزنوی کی ترانہ ریزیاں اور گاندھی جی کی تقریر جب چاہیں سُن سکتے ہیں اور ریڈیو والوں نے تو یہاں تک کمال کر دکھایا ہے کہ آپ اپنے کمرے میں بیٹھے جرمنی کے ڈکٹیٹر کی تقریر سے عین اسی لمحے متمتع ہو سکتے غوغا اندوز ہو سکتے

ہیں، جبکہ وہ برلن کے کسی اجتماع میں بول رہا ہو۔ ان ترقیات کے "پیش عینک" میرے لئے یہ کوئی تعجب خیز بات نہ تھی کہ توتل نے انسانوں کی زبان میں مجھے "برکت بخشی"!

میں نے یہ بات توتل پر بھی ظاہر کر دی کہ بڑی بی! تمہارے بولنے پر مجھے کچھ حیرت نہیں!

توتل نے معاً جواب دیا کہ بیٹا مجھے بھی کوئی تعجب نہیں ہوا کہ تم حاجی کہلاتے ہوئے اور زاہدانہ شکل وصورت رکھتے ہوئے مجھ سے موانست رکھتے ہو۔ میں نے بڑی بڑی مجلسیں دیکھی ہیں اور ایسے ایسے انسانوں کو اپنی طرف راغب پایا ہے کہ کوئی یقین نہ کر سکے۔

میں نے سر ہلاتے ہوئے گلاس اپنے حلق میں انڈیل لیا اور توتل نے ایک لمحہ کی خاموشی کے بعد یوں سلسلۂ کلام جاری کیا۔

"اے رندِ خرابات! تم مومنوں کی سی شکل رکھتے ہو اور شغلِ میکشی کرتے ہو لیکن میں خوش ہوں کہ یہ کام ہوٹل میں بیٹھکر برسرِعام کرتے ہو۔ لوگ تمہاری ڈاڑھی کی طرف دیکھتے ہیں اور پھر توتل کی طرف تکتے ہیں۔ وہ حیران ضرور ہوتے ہوں گے لیکن تمہیں ریا کار نہیں سمجھتے۔ میرے اوقات ایسے بزرگواروں کی صحبت میں بھی گذرے ہیں، جو میرے ساتھ سات پردوں کے پیچھے بے تکلفی فرماتے رہے"

میں جن دنوں امریکہ میں تھی۔ وہاں کے ایک تھیٹر کے مالکوں نے ازرہِ تفنن اعلان کیا کہ ہمارے تھیٹر کے اندر شراب لانا منع ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص کسی خفیہ طریق سے شراب لانے میں کامیاب ہو جائے تو اسے ایک سوڈالر انعام ملے گا۔ اس روز تھیٹر کے دروازے پر مخصوص ملازمین ہر تماشائی کی تلاشی لیتے تھے۔ لیکن جب سٹیج کا پردہ اٹھنے سے

پہلے منیجر صاحب نے اعلان کیا کہ انعام کا دعوے دار آجائے۔ تو ایک سفید ریش پادری جھٹ اُٹھے اور مجھے ہاتھ میں تھامے ہوئے آگے بڑھے۔ جانتے ہو کہ انہوں نے مجھے کہاں چھپا رکھا تھا؟

میں نے نفی میں سر ہلایا اور بوتل بولی ـــــــ " پادری کی داڑھی ناف تک پہنچتی تھی۔ اُس نے میرے گلے میں ڈورا باندھ کر مجھے اپنی گردن میں اس طرح آویزاں کر لیا تھا کہ میں داڑھی کے نیچے بالکل چھپ گئی تھی۔ تلاشی لینے والوں نے پادری کی جیبیں ٹٹولی تھیں، آستینوں کو غور سے دیکھا تھا اور ادب کے ساتھ ان کی ٹوپی بھی اتروا کر دیکھی تھی۔ لیکن کسی کو جرأت نہ ہو سکی تھی کہ وہ اس مقدس ہستی کی داڑھی کا جائزہ بھی لے۔"

میں نے ایک بلند قہقہہ لگایا اور بوتل نے کہا "حاجی میاں! کیا ہنستے ہو؟ اگر مجھ سے ان پاکبازان مے پرست کے "کارنامے" سنو تو حیران رہ جاؤ۔ یہی بزرگوار تو ہیں جن کے متعلق خواجہ حافظ فرما گئے ہیں ؎

واعظاں کیں جلوہ برمحراب ومنبر می کنند
چوں بخلوت می روند آں کار دیگر می کنند

میں نے بوتل کی زبان سے یہ شعر سُن کر اُس کی طرف مسرّت آمیز نگاہوں سے دیکھا اور کہا "آہا! آپ شعر بھی سمجھتی ہیں، ماشاء اللہ!"

بوتل بولی:

"شعر؟ مجھ سے زیادہ کون شعر سمجھے گا؟ میرا اور شعر و سخن کا تو چولی دامن کا ساتھ ہے۔ کتنے شاعر ہیں جو میری اعانت کے بغیر جولانیٔ طبع دکھا سکتے ہیں؟ اور کتنے سخنور ہیں جو مجھے محبوب ترین چیز نہیں سمجھتے؟ اگر شمار کرنے بیٹھو تو ایسے لوگ انگلیوں پر گنے

جا سکتے ہیں اور یہی باعث ہے کہ میری زندگی کا بیشتر حصہ انہی حضرات کی صحبت میں گزرا ہے۔ ان محفلوں میں میرا صرف ایک رقیب رہا ہے۔ جسے معشوق کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ لیکن سچ پوچھو تو اس کا رتبہ مجھ سے بہت کم ہے۔ اس کی صحبت عارضی ہوتی ہے اور جب وہ تھوڑا سا وقت شاعر کی آغوش میں گزار کر چلا جاتا ہے تو اس کے بعد شاعر کی تسکین قلب کا باعث میں ہی ہوتی ہوں اور اس کی یاس انگیز ساعتوں میں دنیائے نشاط کی تخلیق میری ہی کرشمہ سازیوں کا نتیجہ ہوتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ شاعر یہ کہہ کر کسر نفسی کرے:-

مَے سے غرض نشاط ہے کس رُوسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہئے

میں بوتل کی اس گفتگو کو زیادہ دلچسپی کے ساتھ سننے لگا اور بوتل نے عہد حاضر کے کئی شعراء کی رنگین داستانیں بیان کیں اور ان کا کلام سنایا۔ اس کے بعد اُس نے ایک لمبی آہ بھری اور کہا میں نے ہر چند شعراء اور غیر شعراء حضرات کی صحبت میں رہ کر بہت لُطف اٹھایا ہے۔ لیکن میرے دل پر ایک بوجھ ایسا ہے کہ میں اسکے نیچے دبی جاتی ہوں۔

میں نے اُس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور گلاس میں ایک "ڈبل پیگ" ڈالتے ہوئے کہا "لاؤ میں تمہارے بوجھ کو ہلکا کئے دیتا ہوں۔"

بوتل مسکرا کے بولی:-

"نہیں میرے حاجی! یہ بوجھ نہیں جو تم سمجھے ہو۔ بلکہ وہ کچھ اور چیز ہے۔ یہ بوجھ تو مجھے بے حد عزیز ہے۔ کیونکہ اسی کے طفیل مجھے رنگا رنگ کے انسانوں کی صحبت

نصیب ہوتی ہے۔ ورنہ مجھے اس دُنیا میں کوئی مُنہ نہ لگائے میں نے جس بوجھ کا ذکر کیا ہے۔ وہ حضرتِ انسان کی بیوفائیاں ہیں؛

میں نے پوچھا "مثلاً؟"

بوتل نے پھر ایک آہ بھری اور کہا۔

"یہ داستان طویل ہے میاں حاجی! اس کے لئے مجھے اپنے تمام واقعات زندگی دُہرانے پڑیں گے۔ لیکن مختصراً کہتی ہوں کہ میری حیات آواگون کا ایک لاانتہا ہی سلسلہ ہے۔ میں مر مر کر بار بار زندہ ہوتی ہوں۔ میری زندگی کا زمانہ وہ ہے جب کہ میں بادۂ گلفام سے پُر ہوتی ہوں اور موت کے ایام وہ ہیں جب کہ خالی ہو کر کسمپرسی کی مصیبت میں مبتلا رہتی ہوں۔ زندہ ہوتی ہوں تو میرے دن بڑی شان سے گزرتے ہیں۔ کبھی قصرِ شاہی میں بار پاتی اور کبھی میکدے کی رونقوں سے لطف اندوز ہوتی ہوں۔ گاہے کسی رندِ مشرب پارسا کے حجرے کی زینت بڑھاتی ہوں اور گاہے بُتانِ مہوش کی آرائشِ محفل بنتی ہوں۔ لیکن جب خالی ہو جاتی ہوں، تو یہ انسان ـــــ بے وفا انسان، مجھے اس نفرت کے ساتھ پھینک دیتے ہیں۔ گویا میری ان کی کبھی آشنائی نہ تھی۔ دُور کیوں جائیے۔ تمہاری ہی بات کہتی ہوں۔ تھوڑے عرصے میں تم مجھے خالی کر دو گے اور اسی میز پر چھوڑ کر چلے جاؤ گے۔ ہوٹل کا نوکر آئے گا اور مجھے اٹھا کر اس غلیظ و تاریک کوٹھڑی میں پھینک دے گا۔ جہاں میری سینکڑوں بہنیں قید کی زندگی بسر کر رہی ہیں۔ اس کے بعد ہمیں بوریوں میں بند کر کے دربدر پھرایا جائے گا اور خدا جانے کتنے سال گزرنے کے بعد ہمیں پھر زندہ کیا جائے گا۔ نئے لیبل لگیں گے اور مے فروش کی خوبصورت الماری میں

جگہ ملے گی ـــــ درمیان کا زمانہ تو موت جس مصیبت میں گذرے گا۔ اس کے تصور سے تمہارے قسم کلیجہ پھٹا جاتا ہے اور انسان کی بے وفائی پر جگر خون ہوا جاتا ہے ـــــ کہ میں اس کی اتنی خدمت کروں اور وہ مجھے کوڑے کرکٹ میں گلنے سڑنے کے لئے پھینک دے !

میرے دل پر بوتل کے اس شکوہ کا بہت اثر ہوا۔ میں نے اس غم کو غلط کرنے کیلئے شراب کا بقیہ گلاس میں انڈیل لیا اور کہا۔

"میری پیاری بوتل! تمہاری داستان بڑی درد انگیز ہے۔ لیکن فکر نہ کرو۔ میں تمہیں اپنے گھر لے جاکر اپنے کمرے کے طاق میں رکھوں گا جہاں تم ہمیشہ میری محفل آرائیوں سے لطف اندوز ہوتی رہو گی۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں تمہیں اپنے سے کبھی جدا نہیں کرونگا کیا تم میرے ساتھ جانا پسند کرو گی ؟"

میرے سوال کا کوئی جواب نہ ملا۔ میں نے غور سے بوتل کی طرف دیکھا تو وہ دم توڑ رہی تھی۔ میں نے جھکا اپنا منہ اس کے منہ کے قریب لے گیا اور پھونک مار کر اس میں روح پھونکنی چاہی۔ لیکن اس کی روح قفسِ بلوری سے پرواز کر چکی تھی۔

میں نے بوتل کو اٹھا کر اپنے اوورکوٹ کی جیب میں ڈالا اور گھر کی راہ لی۔ دروازہ پر پہنچ کر دستک دی اور میری بیوی نے دروازہ کھولا جونہی میں نے دروازے کے اندر قدم رکھا، بجلی کی روشنی اور بیگم صاحبہ کی نظر دونوں بیک وقت بوتل کی گردن پر پڑیں جو کوٹ کی جیب سے باہر نکلی ہوئی تھی بیگم صاحبہ غضبناک ہو کر بولیں۔

"پھر وہی حرکت ؟ اس عمر میں شراب پیتے ہوئے شرم نہیں آتی ؟ اور پھر یہ بیلا کی کہ شراب کی بوتل جیب میں لئے گھر آرہے ہو۔"

مَیں نے نرمی سے کہا:۔

"خفا کیوں ہو رہی ہیں آپ؟ ذرا تحقیق تو کر لی ہوتی۔ خالی بوتل ہے خالی بوتل"

یہ سُنکر بیگم کے "مزاج کا کانٹا" بدل گیا اور اس کے چہرے سے غصّے کے آثار کافور ہو گئے۔ اُس نے جھپٹ کر بوتل میری جیب سے نکالی اور بجلی کے قمقمے کے سامنے اسے غور سے دیکھکر مطمئن ہو گئی۔ میں دالان کی طرف بڑھا اور کھانا کھا کر سو گیا۔

صبح کے وقت میں ابھی اپنے بستر پر لیٹا شراب کے مابعد کی مصیبت میں گرفتار تھا کہ گلی سے آواز آئی "خالی بوتل" ——— معاً میری بیوی پکار اٹھی "خالی بوتل والے ادھر آنا"

——— بوتل کباڑ خانے کی زندگی بسر کرنے جا رہی تھی اور میرا وعدہ ٹوٹ رہا تھا۔

# متحرک مشاعرہ

یوں تو مشاعرہ کے سامعین اور خود شعراء حضرات کی عجیب وغریب حرکتوں کے باعث تمام مشاعرے "متحرک" کہلانے کے مستحق ہیں۔ اور لاہور کے مشاعرے تو اس سے کہیں زیادہ بڑھکر "متزلزل" کی حد کو پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن میرا مطلب یہاں "متحرک مشاعرہ" سے وہ مشاعرہ ہے جو سفری سرکس کی طرح ایک شہر سے دوسرے شہر تک حرکت کرے بلکہ موٹر یا ریل گاڑی ہی میں ہوتا چلا جائے۔

اس قسم کے مشاعرے میں شریک ہونے کا موقع مجھے بھی ایک بار ملا ہے۔ آقائے مرتضیٰ احمد خاں درّانی محمدزئی میکش المتخلص بہ . . . . . (آپ نے اپنے اشعار میں تخلص نہیں برتا۔ اسلئے معلوم نہیں کہ ان الفاظ کی قطار میں آپ کا تخلص کون سا ہے) جناب اختر شیرانی مسٹر حفیظ لبست جالندھری یعنی ہوشیارپوری اور سید الطاف مشہدی

لائل پور کے مشاعرہ میں شریک ہونے کے لئے جارہے تھے اور یہ خاکسار حاجی لق لق بھی ان کیسا تھ "وغیرہ" کا کام دے رہا تھا۔

ہم لوگ لاری میں بیٹھے تھے صبح کے سہانے وقت بیرونِ شہر کی آزاد فضا اور دیہات کے قدرتی مناظر سے شعرا حضرات کی طبیعتیں لہرا گئیں وہ بھانت بھانت کی بولیاں بولنے لگے اور فی البدیہہ شاعری ہونے لگی۔ ایک صاحب نے فرمایا:۔

کیا خوب چھیڑ چھاڑ ہے بادِ نسیم کی

دوسرے حضرت بول اُٹھے:۔

پردہ اٹھاکے دیکھ لو لڑکی حکیم کی

تیسرے نے نہر کو دیکھ کر کہا:۔

اگر شراب رواں آب نہر ہو جاتا

چوتھے نے مصرعہ لگایا:۔

تو اس کے پہلو میں آباد شہر ہو جاتا

میں نے عرض کیا میں نہ مانوں۔ میں نہ مانوں "پہلو" نے مصرع کا ستیاناس کر دیا یہ شعر یوں ہونا چاہئے ؎

اگر شراب رواں آب نہر ہو جاتا

تو ہم فوراً یہیں لاری کھڑی کر لیتے

قہقہوں نے میری "نیچرل شاعری" کی داد دی اور میں نے "آداب عرض" "آداب عرض" کہہ کہہ کر شکریہ ادا کیا۔

سڑک کے کنارے گاؤں بھی آتے تھے جن کی دیواروں پر جلی حروف میں اس قسم

کے جملے لکھے تھے۔

"کھاد گڑھوں میں رکھو۔"

"کپاس لائنوں میں بونی چاہیئے"

"مکانوں میں روشندان رکھو۔"

یہ نصیحتیں پڑھ پڑھ کر شعراء حضرات کے جسم میں راجہ حسن اختر صاحب "مصلح دیہات" کی روح حلول کر گئی اور "اصلاح دیہاتی" شاعری شروع ہو گئی۔ جناب حفیظ نے جو پنجاب کی سب سے زیادہ زراعتی اور زرخیز ضلع کے باشندے ہیں کسانوں کی یہ پنجابی ضرب المثل "بطور طرح" پیش کی:۔

ڈڈھ بوسی لگنی ڈانگو ڈانگ کیاہ

اس پر مصرعے لگائے گئے اور بعدہٗ وہ تمام کہاوتیں یکے بعد دیگرے تختۂ مشق بنائی گئیں جو ہم نے "کھیتی کی پہلی کتاب" میں پڑھی تھیں

اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ "حضرات! یوں مزا نہیں آتا۔ ایک باقاعدہ مشاعرہ منعقد ہونا چاہیئے۔ آپ جانتے ہیں کہ مغربی ممالک میں لاریوں اور ریل گاڑیوں کے اندر سینما اور ریڈیو وغیرہ تفریحات موجود ہوتی ہیں۔ اس لئے ہم اگر زیادہ توفیق نہیں رکھتے تو اس لاری میں ایک مشاعرہ ہی کر ڈالیں۔"

سب نے میری تائید کی۔ چنانچہ لائل پور بس سروس کے زیر اہتمام اور آقائے مرتضیٰ احمد خاں کے زیر صدارت شاعرانِ لاہور کا ایک عظیم الشان مشاعرہ لاری نمبر… کے وسیع ہال میں ۸ بجے قبل دوپہر منعقد ہوا۔ ہال ۲۲ سواریوں "مع کلینر" سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا حتیٰ کہ بالائی گیلری میں بھی اس قدر سامان پڑا تھا کہ تل دھرنے کو بھی جگہ نہ تھی۔

لاری کی گڑگڑ کی گونج میں صاحبِ صدر گرتے پڑتے اُٹھے اور آپ نے مشاعرہ کے اغراض ومقاصد بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ سفر کاٹنے کے لئے یہ اچھی تفریح ہے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ کوئی صاحب مصرعہ طرح تجویز فرمائیں اور سب حضرات اس پر گرہ لگائیں۔

اتنے میں ایک سواری نے اپنے قریب کے شاعر سے کہا" بابوجی ماچس دینا ــــ" یہ شاعر جناب الطاف مشہدی تھے۔ انہوں نے کہا، واہ بھئی واہ تم نے تو آدھا مصرعہ کہہ دیا لیجئے میں اسے پورا کرکے بطور مصرعہ طرح پیش کرتا ہوں۔

آپ نے ایک لمحہ کی خاموشی کے بعد کہا ؎

از رہِ لطف وکرم بابوجی ماچس دینا

بس مشاعرہ شروع ہوگیا۔ جناب حفیظ بولے ؎

بزمِ اُردو میں نئی شمع جلانا ہے مجھے
از رہِ لطف وکرم بابوجی ماچس دینا

حضرت اختر شیرانی نے کہا ؎

درجۂ سُکرِ شراب اس کو جلا کر دیکھیں
از رہِ لطف وکرم بابوجی ماچس دینا

سید الطاف مشہدی نے فرمایا ؎

باغِ اُردو کے خس وخار جلا کر رکھ دیں
از رہِ لطف وکرم بابوجی ماچس دینا

اختر شیرانی یہ سُنکر میری داڑھی پر ہاتھ پھیرنے لگے اور قہقہوں کی آواز سے لاری

گونج اٹھی۔ اس کے بعد صاحبِ صدر نے ذیل کی افغانی گرہ لگائی ؎

غم غلط کردن مانیست بجز شغلِ سگار
از رہِ لطف و کرم بابو جی ماچس دینا

یہ دَور ختم ہوا اور جناب اختر شیرانی کے اس مصرعہ سے دوسرا دَور شروع ہوا اور فرمائش ہوئی کہ مطلع کہا جائے ؎

مصیبت ہے کہ ہم گرمی میں لائل پور جاتے ہیں

جناب حفیظ نے کہا ؎

نکل کر باغِ رضواں سے سوئے تنور جاتے ہیں
مصیبت ہے کہ ہم گرمی میں لائل پور جاتے ہیں

حضرتِ اختر بولے ؎

تلاشِ جلوۂ سلمےٰ میں سوئے طور جاتے ہیں
مصیبت ہے کہ ہم گرمی میں لائل پور جاتے ہیں

سیّد الطاف نے فرمایا ؎

ہیں کچھ صوفی بھی ہم میں اور کچھ مخمور جاتے ہیں
مصیبت ہے کہ ہم گرمی میں لائل پور جاتے ہیں

میں نے عرض کیا کہ نیا مصرعہ کہنے کی بجائے الطاف صاحب کے مصرعہ میں ترمیم کرنا چاہتا ہوں۔ اسے یوں ہونا چاہئے تھا ؎

ہیں کچھ انساں بھی ہم میں اور کچھ لنگور جاتے ہیں
مصیبت ہے کہ ہم گرمی میں لائل پور جاتے ہیں

صاحب صدر نے اس موقع پر مداخلت فرمائی اور مجھ سے مخاطب ہو کر کہا کہ "سید الطاف کے مصرعہ میں آپ کا ذکر تو نہیں؟"

مشاعرہ یہیں تک پہنچا تھا کہ لاری ٹھہر گئی اور معلوم ہوا کہ یہ لائل پور کا اڈا ہے۔

چنانچہ مشاعرہ بخیر و عافیت اور "ڈرائیور زندہ باد" کے نعروں پر ختم ہوا۔ ہم سب لوگ لاری سے اترے اور چلتے چلتے اختر صاحب نے سکھ موٹر ڈرائیور سے مخاطب ہو کر کہا ؎

اب تو لاری سے جا رہے ہیں میر — پھر ملیں گے اگر خدا لایا

ڈرائیور صاحب پر یا تو مشاعرے کا اثر غالب آ چکا تھا یا وہ سکھ ہونے کے باعث شاعر مزاج واقع ہوئے تھے۔ آپ نے جھٹ جواب دیا ؎

"یار ہوں گے ملن گے آپے — پچھے پچھے کیہہ نساں — با رہواں گے۔"

# ماتا

ہم اس گلی میں سے ہر روز صبح و شام گزرتے تھے اور چلمنوں والے دو منزلہ مکان کے سامنے چند منٹ ٹھہر کر، اپنی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچا لیا کرتے تھے ؎

کیا سمجھے آپ ؟ افسانہ عشق کی تمہید ؟ اور اسی کوچے کا ذکر جس کے متعلق شاعر نے کہا ہے ؎

ترے کوچے ہر بہانے ہمیں دن سے رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا، کبھی اس سے بات کرنا

نہیں میاں! نہ وہ گلی کوچۂ صنم تھی کہ شوقِ نظارہ ہمیں وہاں لے جاتا ہو اور نہ وہ دو منزلہ مکان منزلِ جاناں تھا کہ کوئی پسِ چلمن بیٹھا ہوتا ہو اور ہم دل پر ہاتھ رکھ کر یہ کہا کرتے ہوں ؎

صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

بات یہ ہے کہ ہمارے دفتر آنے جانے کا یہی راستہ تھا اور ہمیں مجبوراً اسی گلی سے ہر روز گذرنا پڑتا تھا۔ ہم اسے گلی اس لئے کہہ رہے ہیں کہ بلدیہ کے نزدیک یہ گلی تھی اور اُس نے اُس کے ایک سرے پر ایک بورڈ لگا رکھا تھا جس پر "جاوید سٹریٹ" مرقوم تھا ورنہ یہ ایک "بنجر" سا راستہ تھا جس کے ایک طرف پونے میل تک میدان صاف اور دوسری طرف کہیں کہیں یک منزلہ اور دو منزلہ مکان کھڑے تھے۔ یہ ایک نو آبادی کا حصّہ تھا جو آج کل ماشاء اللہ ''لحیم و شحیم'' آبادی بنا ہوا ہے۔

گرمیوں کے دنوں میں ہمیں بارہ بجے کے قریب اس راستہ سے گذرنا پڑتا تھا تو دُھوپ کی شدت سے دماغ پگھلنے لگتا تھا اور آنکھیں چلچلا اٹھتی تھیں۔ ایک دو منزلہ مکان کے سامنے شیشم کا درخت تھا اور یہی ہمارے سفر کے "انٹرول" کا کام دیتا تھا۔ ہم ہانپتے ہوئے اُس کے نیچے پہنچتے تھے تو جان میں جان آجاتی تھی اور آنکھوں میں کچھ ٹھنڈک پیدا ہو جاتی تھی چند منٹ یہاں سستا کر ہم آگے چل دیتے تھے اور یہ ہمارا روز کا معمول تھا۔

ایک روز ہم شیشم کے درخت کے نیچے کھڑے تھے کہ مکان کی ڈیوڑھی کی چلمن میں حرکت پیدا ہوئی اور ایک زنانہ آواز ہمارے کان میں آئی :۔

"بھائی ذرا ادھر آنا!"

ہم گھبرائے کہ یہ ہماری "بہن" کون؟ اور سوچنے لگے کہ پرایا مکان ہے جائیں یا نہ جائیں۔ اتنے میں پھر آواز آئی ـــــ "بھائی مجھے خط پڑھوانا ہے۔ آجائیے"

ہم چلمن کے قریب چلے گئے اور ایک زنانہ ہاتھ چلمن سے باہر نکلا جس میں ایک پوسٹ کارڈ تھا۔ ہم نے کارڈ لے لیا اور پہلے خود مطالعہ کر کے پھر انہیں سنا دیا۔ لکھا تھا :۔

ہمشیرہ صاحبہ طولعمرہٗ

بعد سلام کیواضح ہو کہ اس جگہ خیریت ہے اور خیریت آپ کی خدا ئےکریم
سے نیک مطلوب ہوں صورت احوال یہ ہے کہ ماتا مر گئی ہے۔ کوئی فکر کریں
رونے دھونے سے کچھ فائدہ نہیں حوصلہ کرنا سب کو درجہ بدرجہ سلام،

جب ہم نے " ماتا مر گئی ہے " والا جملہ پڑھا تو خاتون نے دریافت کیا کہ اس کا کیا مطلب
ہے۔ ہم نے بتایا کہ ماتا ہندی میں ماں کو کہتے ہیں۔ خاتون نے کارڈ ہمارے ہاتھ سے لے لیا
اور ایک لمحے کے بعد گھر میں نوحہ وزاری سے کہرام مچ گیا

شام کو جب ہم وہاں سے گزرے تو دیکھا کہ اس شیشم کے درخت کے نیچے صف ماتم
بچھی ہے اور بیس تیس آدمی بیٹھے دنیا کی بے ثباتی پر تبصرہ فرما رہے ہیں۔ ہم سلام علیکم
کہہ کر گزر گئے ہیں۔

کوئی چار دن گزرے ہوں گے کہ جب ہم درخت کے قریب پہنچے تو چلمن کے پیچھے
سے آواز آئی " یہ ہے وہ آدمی جس نے چٹھی پڑھی تھی " اور معاً ایک آدمی جو شاید اس خاتون کا
خاوند تھا چلمن اٹھا کر باہر آیا۔ اور بولا " بھائی صاحب ذرا ٹھہر جاؤ "

ہم ٹھہر گئے۔ ہم نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں وہی کارڈ تھا جو ہم نے پہلے پڑھا تھا
یہ شخص بولا " یہ بتایئے کہ آپ چنے دیکر تو نہیں پڑھتے تھے "؟

ہم نے پوچھا " کیوں "؟ جواب ملا " آپ نے ہمارے گھر میں خواہ مخواہ ماتم بپا کر دیا
حالانکہ کارڈ میں یہ لکھا ہے کہ ماتا مر گئی ہے۔ یعنی چیچک دور ہو گئی ہے۔ ہم نے کارڈ اٹھا تو ہمیں
لبا اس پر نگاہ ڈالی اور بگڑ کر کہا۔ لیکن خدا کے لئے یہ تو بتاؤ کہ " رونے دھونے سے کچھ فائدہ
نہیں حوصلہ کرنا " کا کیا مطلب ہے "؟ پہلوان صاحب نے جواب دیا کہ میاں جی میری بڑی

کی چھوٹی ہمشیرہ دو تین ہفتے ہوئے مرچکی ہے اور اس کے بھائی نے تسلی دی ہے کہ اس کے غم میں جان نہ کھونا۔

ہم نے حیران ہو کر کہا۔ لاحول ولا قوۃ۔ ہمیں اس سیاق وسباق کی کیا خبر تھی؟

# عینک کا انتقال

جب سے مجھے عینک لگانے کی عادت ہوئی ہے، میری چار عینکیں اغوا ہو چکی ہیں۔ پولیس کو فقیر ایپی پر شبہ ہے اور اسی شبہ کی بنا پر فوج سرحد آزاد کے علاقہ میں "مصروف تحقیقات" ہے۔ لیکن میرے احباب یہ سن کر بہت افسوس کریں گے کہ میری پانچویں عینک جو بخاری واچ ہاؤس پشاور کا عطیہ تھی۔ داعیٔ اجل کو لبیک کہہ گئی ہے (انا للہ وانا الیہ راجعون)، اور فرزندانِ توحید کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر یہ سُن کر نعرۂ تکبیر بلند کرے گا کہ یہ پشاوری عینک لاہور کے ایک ہندو مسلم فساد میں شہید ہوئی ـــــ اللہ اکبر!

ابتدائے فساد کا باعث میرے دوست مسٹر شبیر احمد تھے جو ولایت سے ایک ایسی ڈگری لیکر آئے ہیں کہ انہیں سبزی منڈی میں بھی کوئی کام نہیں ملتا۔ شبیر احمد کی طبیعت سکول کے زمانہ ہی میں بڑی شوخ و طرار واقع ہوئی تھی، لیکن ولایت کے سہاگے نے انکی

طبیعت کے سونے پر ایسا کام کر دیا کہ اب وہ فتنہ سے قیامت بن چکے ہیں جس خیال کا اظہار مادری زبان میں نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے انگریزی زبان استعمال کرتے اور چونکہ کسی خیال کو مادری زبان میں ظاہر نہیں کر سکتے۔ اس لئے زیادہ تر انگریزی ہی میں گفتگو کرتے ہیں اُردو اور خُدا سے آپ کو بہت نفرت ہے۔ اس لئے "زمیندار" کی بجائے "سٹیٹسمین" پڑھتے ہیں اور خدا کے نام پر چیں بجبیں ہوتے ہیں۔ اکڑفوں کا یہ عالم ہے کہ لنڈے بازار میں اس شان سے گزرتے ہیں کہ گویا ٹرفلگر سکوئر کی سیر فرما رہے ہیں۔

مجھے اپنے دوست کی مذمت منظور نہیں بلکہ یہ چند سطور صرف اس لئے لکھ دی ہیں کہ سند رہیں اور احباب پر یہ بات ظاہر ہو جائے کہ میں اُن ولایت زدہ نوجوانوں کی تقلیدی حرکات سے کس قدر بیزار ہوں جو اپنے وطن میں آکر بھی ولایتی معاشرت کی تقلید کو کارِ ثواب خیال کرتے ہیں۔

میرے اسی دوست مسٹر شبیر احمد کو ہی لیجئے۔ آپ ہمیشہ "کیپسٹن" کے سگریٹ پیتے ہیں اور اس تخصیص کا باعث صرف یہ ہے کہ آپ نے لندن میں ایک پارلیمنٹ ممبر کو کیپسٹن کے سگریٹ پیتے دیکھ لیا تھا۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ لاہور میں بھی یہ سگریٹ مل سکتے ہیں۔ ورنہ میرے دوست کو ان کے لئے ولایت آرڈر بھیجنے کی ضرورت لاحق رہتی

جس ہندو مسلم فساد میں میری عینک شہید ہوئی۔ اس کا باعث بھی کمبخت کیپسٹن سگریٹ ہی تھے۔ میں اور شبیر احمد ریلوے روڈ پر جا رہے تھے کہ میرے دوست کو سگریٹ خریدنے کی حاجت ہوئی۔ اس لئے ہم ایک ہندو سگریٹ فروش کی دکان پر ٹھہر گئے۔ شبیر احمد نے کیپسٹن کی ڈبیہ لیکر دکاندار کو ایک روپیہ دیا۔ دکاندار نے روپے کو دیکھا بھالا اور یہ کہکر لوٹا دیا کہ بابو جی روپیہ بدل دیجئے۔

اب ایک ولایت زدہ نوجوان کے لئے یہ بات بہت توہین کا باعث ہے کہ سبزی والا اس کے روپے کو کھوٹا کہا جاتے۔ شبیر احمد یہ توقع رکھتے تھے کہ دکاندار ان کا روپیہ رکھ لیتا اور ان کا پتہ لکھ لیتا۔ دوسرے دن ایک چپراسی کے ہاتھ روپیہ ان کے مکان پر بھیج دیتا اور ساتھ ہی ایک ٹائپ شدہ چٹھی ارسال کرتا جس میں لکھا ہوتا کہ "جناب من! کل جو روپیہ آپ دے گئے تھے۔ اس میں کچھ نقص ہے۔ اس لئے میں نہایت ادب کیساتھ اسے واپس کرتا ہوں اور عرض پرداز ہوں کہ براہ کرم اسکی جگہ کوئی بہتر روپیہ ارسال فرمائیں۔ اس تکلیف کے لئے میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں اور اچھا روپیہ بھیجنے کا پیشگی شکریہ ادا کرتا ہوں"۔

شبیر احمد نے کھوٹا روپیہ ہاتھ میں لیکر دوکاندار کی طرف غضب آلود نگاہوں سے دیکھا اور اُسے بٹوے میں ڈال کر اس کی بجائے پانچ روپے کا ایک نوٹ دوکاندار کے سامنے پھینک دیا۔ دوکاندار بولا "جناب میرے پاس کریانہ نہیں"۔

شبیر احمد نے غصے میں آکر نوٹ اٹھا لیا اور دوکاندار نے ان کے ہاتھ سے ڈبہ لے لی۔ یہ توہین میرے دوست کے لئے بالکل ناقابل برداشت تھی۔ اس لئے اُس نے بڑے جوش میں آکر کہا "یو۔ ڈیم فول۔ تم نے ہمیں کوئی چور سمجھ رکھا ہے کہ ڈبیہ ہاتھ سے چھین لی ہے؟ ادھر لاؤ ڈبیہ!"

دوکاندار بولا "ادھر لائیے دام"

دکاندار کا یہ کہنا تھا کہ بابو صاحب نے انگریزی اور پنجابی کی گنگا جمنی گالیوں کا تار باندھ دیا۔

چند گالیاں تو دکاندار نے صبر و تحمل سے سُنیں۔ لیکن اس کے بعد وہ بھی بے قابو ہو گیا اور گالیوں کا جواب گالیوں سے دینے کی بجائے اُس نے بابو جی کو ٹکٹائی سے پکڑ لیا۔

بابوجی دونوں ہاتھوں سے نکٹائی چھڑانے کی کوشش کر رہے تھے کہ دکاندار نے دائیں ہاتھ سے گھونسہ بازی شروع کردی۔ ادھر بابو صاحب نے بھی اپنے ہاتھوں کو حرکت دینی چاہی۔ لیکن ایک ہمسایہ دکاندار نے جلدی سے آکر بابو صاحب کے دونوں بازو پکڑ لئے اور سگریٹ فروش بڑے آرام کے ساتھ میرے دوست کی تواضع میں مصروف ہوگیا۔

میں اپنے دوست کے لئے جان تک لڑا دیتا۔ لیکن میں ایڈیٹر تھا۔ اس لئے سوچ رہا تھا کہ میری مداخلت کہیں پریس برانچ والوں کی قانونی زد میں تو نہ آجائے گی۔ پریس برانچ کے تصور سے میرا بدن کانپ اُٹھا اور میں نے اپنے دوست کی عملی اعانت کی بجائے اخلاقی مدد کرنی شروع کردی۔ میں نے "حملہ آوروں" کو مخاطب کر کے بلند آواز سے کہا کہ :۔

"انہیں چھوڑ دو۔ ورنہ یاد رکھو کہ اخبار میں تمہارے خلاف نوٹ لکھ کر تمہارا کچومر نکال دونگا"

لیکن معلوم ہوتا تھا۔ کہ حملہ آور اخبار بینی اور اخبار فہمی کے ذوق سے محروم ہیں۔

اتنے میں تیس پینتیس ہندو ارد گرد جمع ہوگئے تھے اور بجائے اس کے کہ کچھ بیچ بچاؤ کرتے، وہ یہ کہنے لگے "مارو مسلے کو، خوب ٹکاؤ!"

میں نے حملہ آوروں سے مایوس ہو کر تماشائیوں کی طرف توجہ کی اور کہا :۔

"مادرِ وطن کی بدبختی کی انتہا ہے کہ اس کے فرزند ہمیشہ آپس میں دست و گریبان رہتے ہیں، حالانکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم استخلاص وطن کے لئے شیر و شکر ہو کر مصروفِ جدوجہد ہو جائیں اور ذاتی مناقشات کو نظر انداز کر کے اپنے مشترکہ مفاد پر

نگاہ رکھیں، عہدِ ماضی اور زمانہ حال کی زندہ قوموں کی تاریخ کا مطالعہ کیجئے اور دیکھئے کہ ان قوموں نے مذہبی اختلافات کو بالائے طاق رکھکر آزادئ وطن کے لئے کس طرح متحدہ کوششیں کیں۔ عراق کو دیکھو۔ وہاں مسلم نصاریٰ اور یہودی تین قومیں بستی ہیں لیکن ہنوں قوموں نے اپنے اتحاد کے بل بوتے پر تھوڑے ہی عرصے میں سوراج حاصل کرلیا ہے اور آج عراق میں ایک آزاد قومی حکومت قائم ہے۔ ایران کو دیکھو۔ وہاں کبھی مذہبی جھگڑا پیدا نہیں ہوا۔ مصطفےٰ کمال پاشا سے سبق حاصل کرو کہ اُس نے مذہب کو سیاست سے بالکل الگ کر کے کس طرح دنیا بھر کی نظروں میں اپنے ملک وقوم کو ممتاز و مفتخر بنادیا۔ آخر ہندوستان ہی پر کیوں خدا کا غضب نازل ہو رہا ہے کہ یہاں ہندو مسلم اتحاد کی کوئی صورت نظر نہیں آتی اور دونوں قومیں ہر وقت بر سرِ پیکار نظر آتی ہیں۔ دور نہ جائیے۔ یہیں دیکھ لیجئے کہ ذرا سی بات پر تین بھائیوں میں باہم ہندو مسلم فساد جاری ہے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟ کیا اپنے وطن کو غیروں کے پنجے سے نجات دلانے کے یہی طور طریقے ہیں؟

اے کاش! کہ مسلم لیگ اور کانگرس کی گفتگوئے مصالحت نتیجہ خیز ثابت ہو اور دونوں قومیں کم از کم سیاسی اغراض کے لئے ہی مل بیٹھیں۔ ورین اثنا ہم حکومت سے استدعا کرتے ہیں کہ وہ اس فساد کے متعلق جو سگریٹ کی ڈبیہ کے باعث رونما ہوا ہے۔ مناسب کارروائی کرے اگر حکام نے توجہ نہ کی تو نتائج کی ذمہ داری انہیں پر عائد ہوگی۔"

میرا یہ "ایڈیٹوریل نوٹ" طول کھینچ کر شاید "لیڈنگ آرٹیکل" بن جاتا۔ لیکن ایک آواز نے میری توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ یہ شبیر احمد کے گرنے کی آواز تھی جو بیہوش ہوکر زمین پر آرہے تھے۔

یہ دیکھکر تماشائیوں میں سے ایک شخص بولا "ارے ظالموں تم نے یہ کیا کر دیا ہے

تم نہیں جانتے کہ یہ حاجی صاحب ایک ننگے زنگی اخبار کے ایڈیٹر ہیں اور محلہ ننگے زنگیوں میں کئی ہزار ننگے زنگی بستے ہیں جب انہیں اس واقعے کی خبر ملے گی تو وہ جوق در جوق یہاں آکر اس محلے کا خاتمہ ہی تو کر دیں گے۔"

میں نے کہا "اور اس بات کا بھی تو تصور کرو کہ جب ہمارے کل کے پرچے میں ان چار کالمی سرخیوں سے خبر چھپے گی کہ :-

## ریلوے روڈ لاہور پر ہندو مسلم فساد

### دو نہتے مسلمانوں پر کئی سو مسلح ہندوؤں کا حملہ

### ہسپتال میں ایک مسلم مضروب کی نازک حالت

تو گیا حشر برپا ہو جائے گا۔ میرے دونوں ہندو دوستوں کو اگر اس بات کی پروا نہیں کہ ان کی اس حرکت سے کل سارے لاہور میں خون کی ندیاں بہ جائیں گی تو کم از کم اس بات کا خیال تو کریں کہ کل نہ ہوں گے اور جیل کی کوٹھڑی۔

میرا یہ کہنا تھا کہ سگریٹ فروش میری طرف بڑھا اور قبل اس کے کہ میں اس کی پیشقدمی پر صدائے احتجاج بلند کروں۔ ایک گرما گرم گھونسا میرے چہرے پر پڑا جس سے میری آنکھیں تو بال بال بچ گئیں لیکن عینک چور چور ہو کر بدر رو میں جا گری میں نے ایک ہی گھونسا کھا کر شاندار پسپائی اختیار کی اور خدا کا شکر ہے کہ دکاندار نے میرا تعاقب نہیں کیا۔ میں نے فوراً ایک تانگے والے کو آواز دی اور اپنے بیہوش دوست کو تانگے میں ڈال کر گھر کی راہ لی۔

اگلے روز جی میں آئی کہ اخبار میں ایک زبردست نوٹ لکھوں۔ لیکن پھر سوچا کہ بدنامی

ہو گی "یکے نقصانِ عینک، دوم شماتتِ ہر یک"۔ یہ خیال کر کے میں نے اپنا ارادہ بدل دیا ——— اب چونکہ اس واقعے کو بہت دن گذر چکے ہیں۔ اس لئے اسے ظاہر کرتا ہوں لیکن ساتھ ہی اس کے پڑھنے والوں سے استدعا کرتا ہوں کہ وہ اس کا ذکر کسی ضمیمہ چھاپنے والے سے نہ کریں۔

میری عینک کا نعم البدل مجھے مل گیا ہے۔ یعنی میرے محترم دوست رائے بہادر ڈاکٹر متھراداس المتخلص بہ موگا نے مجھے ایک عمدہ عینک مرحمت فرمادی ہے۔ تاہم عینکِ مرحومہ کا داغ دل سے نہیں مٹتا۔ خدا عینکِ مرحومہ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور مجھے صبرِ جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔

جو احباب عینکِ مرحومہ کے پسماندگان سے اظہارِ تعزیت کرنا چاہیں وہ ایک تعزیت نامہ مجھے ارسال کریں اور ایک مالکِ بخاری واچ ہاؤس قصہ خوانی بازار پشاور کو۔ میں چونکہ ہر دوست کا شکریہ فرداً فرداً ادا نہیں کر سکوں گا۔ اس لئے اس مضمون کے ذریعے سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ والسلام *

محمد اقبال پرنٹنگ پریس لاہور